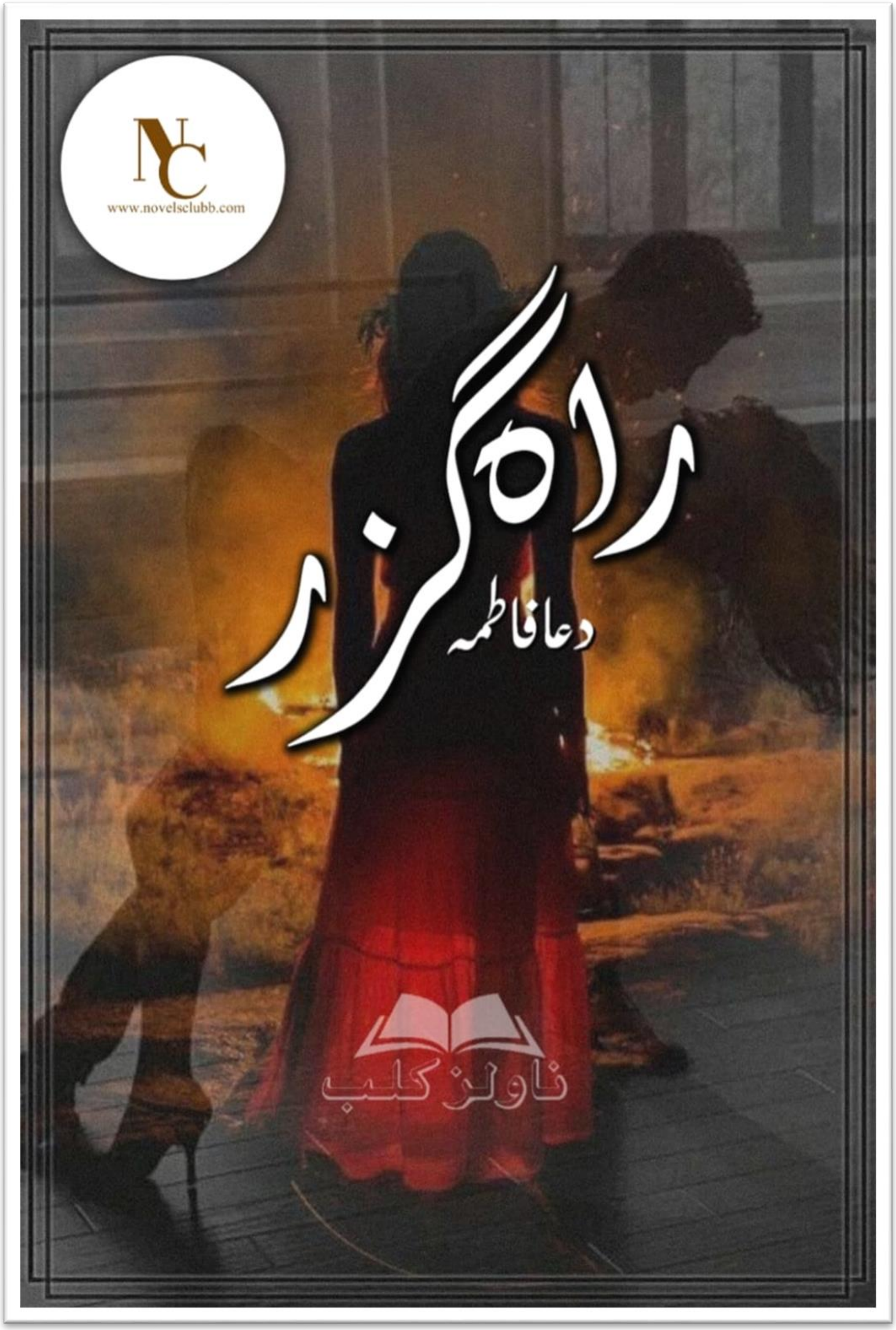
www.novelsclubb.com
راہ گزر
دعا فاطمہ
ناولز کلب

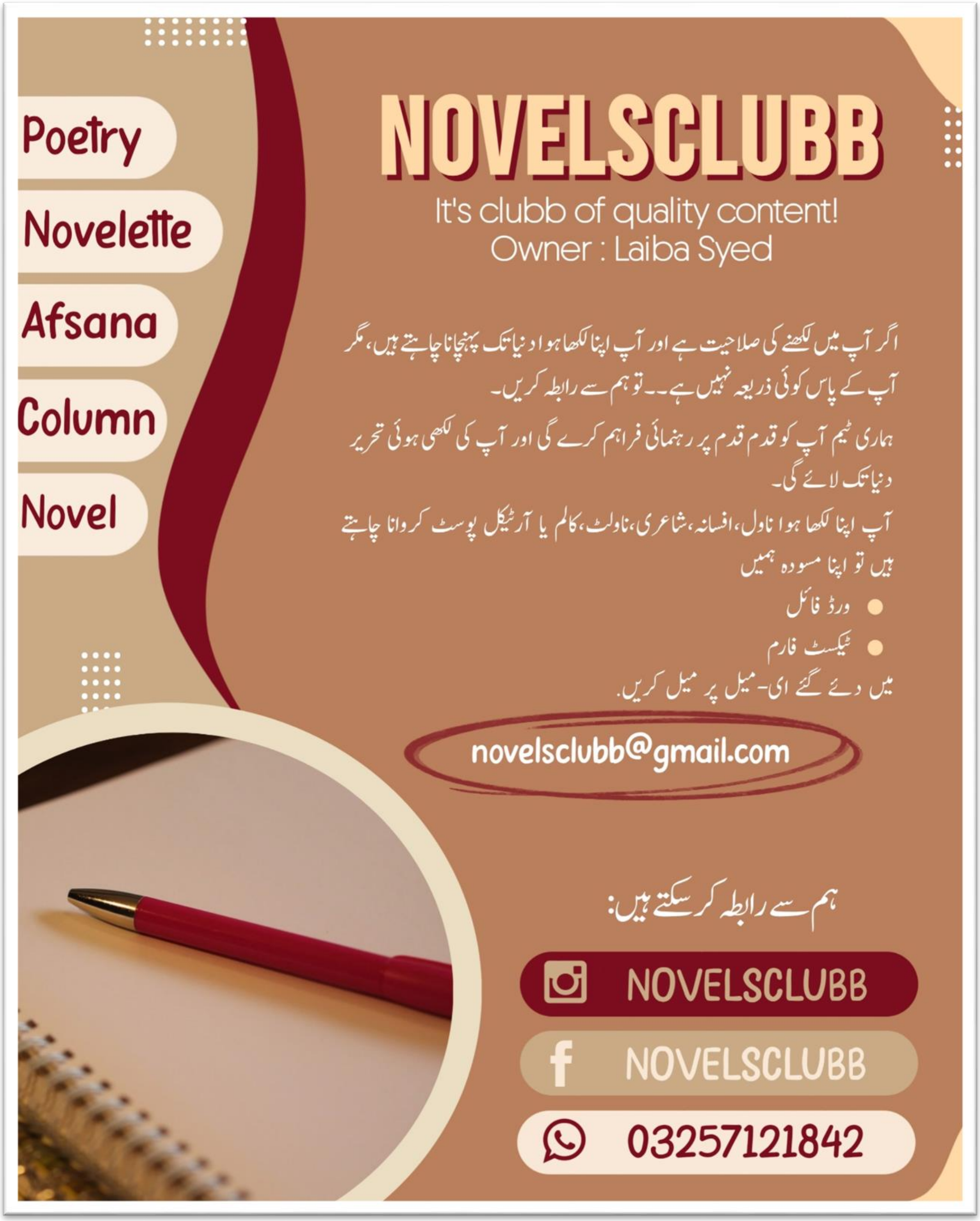
Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دیئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

راہ گزر

از قلم

دعا فاطمہ

www.novelsclubb.com

انتساب

میری زندگی اور اس کی تلخیوں کے نام۔۔۔زندگی کے حقیقی چہرے کے نام۔۔۔زندگی کی تلخ گہرائیوں کے نام!

www.novelsclubb.com

پیش لفظ

یہ کہانی ہے ایمان زاویار کی۔۔۔اس ایمان زاویار کی جو زندگی کے شروع ہوتے ہی اس کی تلخیوں سے جاملتی ہے۔اس ایمان زایار کی جو زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ایمان کھو بیٹھتی ہے۔اس ایمان زاویار کی جس کی زندگی کی تلخیاں ہی اسے اس کا امیان واپس لوٹاتی ہیں۔اس ایمان زاویار کی جو صرف اپنے آپ کے ساتھ اس دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔

کہانی ہے زندگی کی۔اس زندگی کی جو اپنا خوبصورت نقاب اتار پھینکتی ہے۔اس زندگی کی جس کی بدصورت حقیقت سامنے آتی ہے۔اس زندگی کی جو انسان کو چاروں اور سے گھیرے اس کو تنہا کر ڈالتی ہے۔

کہانی ہے راتوں کو رونے والوں کی، کہانی ہے سسکنے والوں کی، کہانی ہے اکیلے رہ جانے والوں کی۔۔۔

www.novelsclubb.com

کہانی ہے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّانے والے رمیص جہانزیب کی۔۔۔

کہانی ہے دور پردیس میں کہیں کھو جانے والے ارتضی مراد کی۔۔۔

داستان ہے غزل ارشد کی۔۔۔داستان ہے ایمان زاویار کی۔۔۔

اس کہانی کی سب سے ڈیزرونگ لکھاری میری نانی ہیں جنہوں نے میری تھیم سن کر ایک ہی بار میں مجھے میری کہانی کا نام بتا کر مجھے میری ناول کا پلاٹ، کلائمیکس اور اختتام تھما دیا۔میری کہانی کو ایک نیا رخ بخشا۔ارشد شریف شہید کی سوانح عمری کچھ الگ لفظوں میں بیان کر کے میں نے ایک اور تھیم کو اس ناول کا حصّہ بنایا ہے۔سب سے آخر میں میری پوری کوشش ہے کہ میں اپنے ذہن میں قائم ہوئے اسباق کو باآسانی اس ناول کے ذریعے آپ تک پہنچا سکوں۔

والسلام

دعا فاطمہ

راہ گزر

از قلم دعا فاطمہ

قسط:5

رات کے پہلے پہر، چپکے سے کوئی میرے آشیاں پر

آیا تھا اپنے پر پھیلائے، لبوں پہ اپنے مسکراہٹ سجائے

نین سیاہ چمکتے حسین و شاداب

زلفیں جیسے ہوں سیاہ آسمان گرد روشن مہتاب

مسکان جیسے کوئی مدھر گیت گھولتی سماعت میں

منظر وہ جیسے شیریں رس گھولتا بصارت میں

دیکھ کر مجھے وہ نہایت نرمی سے بولا

کیا جانتے ہو ہوں میں کون؟

میں وہ جو انس کو کہاں سے کہاں لے جائے

میں وہ جو اوراق کو شجر سے گرائے

میں وہ جو اداس کو ہنسی تھمائے

اور ہنسا کر پھر پہروں رلائے

رلا کر پھر گھنٹوں جگائے

جگا کر پھر پر سکون نیند سلائے

میں وہ جو پلٹوں تو سب بدل ڈالوں

میں وہ جو روٹھوں تو اشکوں کی ندیاں بہاؤں

میں وہ جو ادنی سے انس کو محل لے جاؤں

اور محلوں کے شاہوں کو سڑک پر سلاؤں

میں وہ جو رستوں میں کانٹے بچھاؤں

اور پھر انہی کانٹوں پہ ننگے پیر چلاؤں

میں بدلوں تو سب کچھ ساتھ بدل ڈالوں

میں وہ جو چمکوں تو سب چمکاؤں

سن کر بات اس کی میں دھیرے سے مسکرایا

اور پھر مسکرا کر ہلکا سا کھنکارا

پھر جب بولا تو آنکھیں مسکرانے لگیں

دل کی تاریں بھی پھر کھنکھنانے لگیں

تو قسمت تو سنگ میرے ہے قسمت ساز

www.novelsclubb.com

تو طوفاں تو سکوں ہے میرے ساتھ

تو کچھ بھی نہیں، سب کچھ میرے ساتھ

تو گرجے تو خاموش کرانے والا میرے ساتھ

تو بدلے تو بدلنے والا میرے ساتھ

تو چمکے تو چمکانے والا میرے ساتھ

تو رلائے تو ہنسانے والا میرے ساتھ

تو خلق تو تیرا خالق میرے ساتھ

وہ خالق و مالک و رازق میرے ساتھ

(از خود)

مانچسٹر کی تمام سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ہر ایک شے کو بارش نے گویا خود میں بھگو کر رکھ دیا تھا۔

www.novelsclubb.com

موسم ابر آلود تھا۔ ہر شے بارش کی بوندوں کے پار دھندلاتی جا رہی تھی۔ بارش ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدّت پکڑتی جا رہی تھی۔ دن کا تیسرا پہر تھا۔ ہر جانب چھاؤں چھاؤں سی تھی۔ سڑکوں پر لوگ بھی اکا دکا نظر آتے تھے۔ مانچسٹر یوں تو یو کے کا ہی ایک شہر تھا مگر یہاں کی رونق کا وہ عالم نہ تھا جو لندن کی رونق کا تھا۔ لندن کی تو پھر بات ہی الگ تھی ناں!

ایسے میں ایک اونچی سی سفید رنگ کی عمارت کے نچلے فلور پر موجود اپارٹمنٹ میں اس پہر نیم اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ یوں تو یہ باہر پھیلے اندھیرے کے سبب تھا مگر گھر کے مکینوں نے بھی بتیاں جلانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ فرصت ہی کسے تھی؟

اپارٹمنٹ چھوٹا سا مگر صاف ستھرا تھا۔ ایک درمیانے سائز کا لاؤنج جو نہایت سلیقے سے سجایا گیا تھا، اس کے عین سامنے اسی سے منسلک ایک اوپن کچن تھا جس میں اس وقت ایک لڑکی رخ پھیرے کھڑی تھی۔ وہ سلیب پر رکھی سبزیوں کو چھرے سے کھٹا کھٹ کاٹتی جا رہی تھی۔ قد لمبا تھا۔ بال گہرے سیاہ ایک ڈھیلے جوڑے میں مقید پشت پر جھول رہے تھے۔ اسے پیچھے سے دیکھو تو ایک لمحے کے لیے تو یوں لگے جیسے غزل رمیص کھڑی ہے۔ مگر کچھ آگے جا کر دیکھا جاتا

تو اس کا چہرہ واضح ہوتا۔

تقریباً تیس برس کی وہ ایک نہایت خوبصورت سی لڑکی تھی۔ سفید دودھیالی رنگت، بھوری پرکشش آنکھیں جو فی الوقت تھکاوٹ اور شب بیداری کی چغلی کھاتی تھیں۔ گلابی ہونٹ جو فی الوقت بھینچ رکھے تھے، ایسے جیسے وہ خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے ہوئے ہو۔ سبزیاں کاٹنے کے انداز سے صاف پتا لگتا تھا کہ اسے جلدی تھی۔ گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے یوں کہ گالوں کی ابھری ہڈیاں اور زیادہ ابھری ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے تیزی سے چلتے ہاتھ بھی نہایت دبلے پتلے سے تھے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ یہ پسینہ گرمی کے باعث نہیں، کسی ٹینشن کے باعث آرہا تھا۔

جبھی دروازے کی گھنٹی بجی تو اس نے سبزیاں کاٹتے ہاتھ روک کر چہرہ اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ فوراً سے سبزیاں ویسی کی ویسی چھوڑتی دروازے کی جانب مڑی ہی تھی کہ تیزی سے ہاتھ گھمانے کے باعث سامنے پڑی چھری اس کے ہاتھ کی پشت کو چیر گئی۔ وہ درد سے بلبلائی تھی۔ ہاتھ کی پشت نگاہوں کے سامنے کی تو آنکھوں کے پپوٹے درد کی تکلیف کے باعث فوراً

www.novelsclubb.com

سے بھرنے لگے۔

دروازے پر بیل مسلسل ہو رہی تھی۔وہ جو کوئی بھی تھا، بیل پر ہاتھ رکھ کر گویا بھول ہی گیا تھا۔ اس نے نگاہیں دروازے کی جانب پھیری تھیں پھر ایک بار پھر اپنے ہاتھ کی جانب پھیری تھیں۔کٹ اچھا خاصا لمبا اور گہرا تھا۔اس میں سے خون ایک قطار کی سی صورت لکیروں میں پھسلتا زمین پر گرتا جا رہا تھا۔تکلیف شدید تھی۔آنکھوں سے آنسو بہہ چلے تھے۔

گھنٹی اب بھی بج ہی رہی تھی۔بغیر رکے۔بغیر وقفے کے۔اس نے یوں ہی ہاتھ ایک جانب کو کیے، دوسرے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو رگڑ ڈالے تھے۔اور مڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی تھی۔بیل اب بھی مسلسل بجتی جا رہی تھی۔

"آ رہی ہوں۔"، وہ تسلی دینے کے سے انداز میں صحیح والے ہاتھ سے دروازہ کھولتے ہوئے بولی تو آواز میں اور لہجے میں بھی تکلیف پنہاں تھی۔آنسوؤں کا گیلا پن آواز میں بھی محسوس ہوتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے ایک بتیس تینتیس سال کا آدمی کھڑا نظر آیا تھا۔ماتھے پر ناگواری کے بل لیے وہ لب بھینچے ہوئے تھا۔اس کا ہاتھ اب بھی بیل پر ہی تھا۔اسے دیکھتے ہی اس نے برہمی سے

بیل سے ہاتھ ہٹایا تھا۔ سیاہ آنکھوں میں غصّہ ہلکورے لے رہا تھا۔ سیاہ پینٹ کوٹ پہنے، ایک ہاتھ سے بریف کیس تھامے وہ اسے دیکھتے ہوئے اندر بڑھا تھا۔ وہ ایک جانب کو ہو کر نگاہیں جھکا گئی تھی۔ آدمی کے گھر کے اندر آتے ہی اس نے دروازہ لاک کیا تھا اور جونہی وہ مڑی، وہ اس کے عین سامنے کھڑا، اسی کی جانب رخ کیے، کڑی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ایسا بھی کیا ہو گیا تھا جو اتنی دیر لگادی دروازہ کھولنے میں؟ ایسا کون سا کام تھا جس میں اس قدر مصروف تھی کہ بیل بجنے کی آواز ہی نہ آئی؟"، اس کے لہجے اور الفاظ میں چھپا سوال اس کو برچھی کی مانند اپنے دل میں کھبتا محسوس ہوا تھا۔ یہ انسان ہر وقت ایسی باتیں کر کر کے تھکتا نہیں تھا کیا؟ اس کی نم آنکھیں مزید ڈبڈبا گئی تھیں۔ لب دانتوں تلے دبائے وہ ضبط کرنے کے چکر میں سرخ ہونے لگی تھی۔ وہ نخوت سے سر جھٹکتا اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس کے کٹے ہاتھ پہ ایک نظر ڈالنا تک گوارا نہ کی تھی۔

وہ آنسو پیتی کچن کی اور بڑھ گئی تھی۔ کیبنٹ میں سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر اس نے آنسو پیتے ہوئے سلیب پر رکھا تھا اور پھر سلیب سے گھوم کر سامنے کی طرف لگی کرسیوں میں سے ایک پر

آ بیٹھی تھی۔ بمشکل فرسٹ ایڈ باکس کھول کر اس نے انہی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ایک نظر مڑ کر کمرے کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اب اندر کھڑا اپنا کوٹ اتار کر پلنگ پر پھینک رہا تھا۔ ماتھے پر ناگواری کے چند بل نمودار ہوئے ہوئے تھے۔

وہ صحیح والے ہاتھ سے دھیرے دھیرے اندر دوا کھنگال رہی تھی جب عین اپنی پشت پر سے آتی آواز سے ہل سی گئی۔

"اتنا نہیں ہوتا کہ شوہر گھر آیا ہے تو ایک گلاس پانی ہی لا دوں۔۔۔تف ہے۔۔۔"، وہ اس کے پیچھے کھڑا کہتا جا رہا تھا اور نخوت سے کہتے کہتے اس کی نگاہ یکدم ہی پھسلتے ہوئے اس کے زخمی ہاتھ پر جا ٹکی تھی۔ اس کے الفاظ ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے تھے۔ آنکھوں میں یکدم ہی تشویش سی ابھری تھی۔ وہ ایک ہی جست میں اس کے پیچھے سے گھوم کر آگے آیا تھا۔ برق رفتاری سے اس کا زخمی ہاتھ تھام کر اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا ہے یہ؟"، اس کے لہجے میں فکر اور پریشانی گھلی تھی۔ آنکھوں میں فکر مندی بھرا سوال سا تھا۔ اور ضوفشاں مزید تاب نہ لا سکی تھی۔ یکدم ہی پلکوں کی باڑوں کو توڑتے آنسو ایک کے

بعد ایک اس کے رخساروں پر بہہ چلے تھے۔ نصیر نے سوال کرتے ساتھ ہی اس کا ہاتھ چھوڑتے فرسٹ ایڈ باکس میں ہاتھ ڈالا تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد ہاتھ باہر نکالا تو اس میں دوا، روئی اور پٹی موجود تھی۔

اب وہ نہایت نرمی سے ایک ہاتھ سے اس کا زخمی ہاتھ تھامے، دوسرے سے روئی پہ پایوڈین لگائے اس کا زخم صاف کر رہا تھا۔ ضوفشاں لب ضبط سے دانتوں تلے دبائے اسے زخم صاف کرتے دیکھ رہی تھی۔ ہر کچھ لمحوں میں اس کی ہلکی سی سسکی ابھرتی تھی، جس پر نصیر ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈال کر پھر سے زخم کی جانب متوجہ ہو جاتا۔

"کیسے ہوا ہے یہ؟"، زخم صحیح سے صاف کر کے اب وہ پٹی کھول رہا تھا۔ ضوفی اسے یونہی دیکھے گئی تھی۔

"کچھ پوچھ رہا ہوں میں۔"، اس کے لہجے میں بیک وقت نرمی اور سختی سی تھی۔ ضوفی نے دوسرے ہاتھ سے آنسو صاف کرتے ہوئے ایک ہچکی بھری تھی۔

"چھری سے کٹ گیا۔"، جواب دیا تو نصیر نے سنجیدہ نظریں پھیر کر اسے دیکھا۔

"ڈھنگ سے کام کیا کرو ناں۔لاپرواہی کیوں برتتی ہو؟"، اب وہ ڈانٹتے ہوئے کہتا، صاف روئی پر دوائی لگا کر اس کے زخم پر رکھ رہا تھا۔ ضوفی خاموش ہو گئی تھی۔ کیا کہتی وہ اسے؟

"کب لگا ہے یہ؟"، زخم سے اچھا خاصا خون بہہ رہا تھا تبھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کچھ دیر پہلے ہی لگا ہے۔

"جب آپ نے دروازہ بجایا تھا تب۔"، اس نے مدھم سی آواز میں جواب دیا تو نصیر نے ایک سنجیدہ نظر اس کے چہرے پر ڈالی جو رو رو کر بھیگ چکا تھا۔

"ایسے کام کرتی ہی کیوں ہو جو اتنا ڈر لگے؟"، اور یہ انداز اور یہ الفاظ ایک بار پھر اس کا دل جلا کر راکھ کر گئے تھے۔ زخم میں جلن سی مچی تھی۔ وہ کیسے سمجھاتی اسے؟ کیا کہتی اور کیسے کہتی؟ وہ سنتا ہی کہاں تھا؟

www.novelsclubb.com

اب وہ پٹی اس کے ہاتھ کے گرد باندھ کر سیدھا ہو گیا تھا۔

"اس کو پانی میں مت ڈالنا اب۔ اور دن میں تین بار اس کو صاف کر کے اس کی پٹی کرنا۔۔۔

جب میں گھر میں ہوا کروں گا تو میں کر دیا کروں گا۔ ورنہ میک شیور کہ تین بار اس کی پٹی ہو۔"،

وہ کہتا ہوا اپنی سفید شرٹ کے کف موڑتا کہنیوں تک گھما رہا تھا۔ ضوفی نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ واپس کمرے میں چلا گیا تو وہ گہرا نم سانس خارج کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے ابھی جلدی جلدی کھانا بنانا تھا۔ ورنہ اس کے شوہر کا موڈ کب بگڑ جائے، کون جانتا تھا۔

☆☆☆

کراچی میں روشن سی صبح نے اپنے پر پھیلائے تو ہر شے پر روشنی غالب آگئی۔ پرندے چہچہاتے ہوئے اپنے آشیانوں سے نکلتے اڑتے ہوئے رزق کی تلاش میں بھٹکنے لگے تھے۔ آسمان پر آج سفید روئی جیسے بادل نیلے سمندر میں تیرتے نظر آ رہے تھے۔۔۔ یہ بادل بہت پیارے، بالکل ویسے تھے جیسے عموماً بارش کے بعد کھلے نظر آتے ہیں۔

صبح کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا۔ رمیص جہانزیب کے گھر میں خوب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ایمان بالکل تیار سی لاؤنج میں کھڑی ثمرین کی منتظر تھی۔ آسمانی نیلے رنگ کی گھٹنوں سے نیچے تک آتی لانگ فراک کے ساتھ سفید کھلا پاجامہ اور سفید ہی دوپٹہ پہنے وہ بالکل تیار لگتی

تھی۔حسنہ کی دی ہوئی شال سے اس نے خود کو ڈھک رکھا تھا۔سفید دوپٹہ اسکارف کی سی صورت چہرے کے گرد باندھ کر شانوں پر پھیلا رکھا تھا۔ایک کاندھے سے نیلے رنگ کا پرس لٹکائے وہ بار بار لاؤنج سے منسلک ثمرین کے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔

گندمی چہرہ دھلا دھلا یا شفاف سا لگ رہا تھا۔کسی بھی میک اپ سے پاک! جبھی ثمرین کمرے سے دوڑتی ہوئی اس کی جانب آئی تھی۔

"چلو ایمان۔"،وہ کہتی ہوئی باہر کی جانب بڑھ گئی تو ایمان بھی اس کی معیت میں باہر چلی آئی۔

ثمرین پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی تو ایمان بھی اگلی جانب سے چلتی ہوئی آکر دوسری طرف بیٹھ گئی۔دروازہ لاک کر کے اس نے مڑ کر تسلی سے ایک بار ثمرین کو دیکھا تھا۔شوخ گلابی رنگ کے قمیض شلوار کے ساتھ ہم رنگ ہی دوپٹہ سر اور شانوں پر پھیلائے وہ لبوں پر گہری گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائے ہوئے تھی۔آنکھیں کاجل سے لبریز اور بالوں کی چند لٹیں رخسار کے اطراف میں گرائے۔۔۔وہ اچھی تو لگ رہی تھی مگر۔۔۔

"تم کیا اپنی شادی پر جا رہی ہو؟"،ایمان نے خاصی حیرت سے اس سے پوچھا تو ثمرین مسکرائی۔

پھر انگلیاں مروڑتے ہوئے ڈھیر سارا شرمانے کے بعد نزاکت سے گویا ہوئی۔

"وہ دراصل میرا منگتیر بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے ناں اور وہ ہمیں کمپنی دینے بھی آئے گا۔۔۔تو بس اسی لیے۔"،اس نے شرمانے کے دوران بمشکل بات مکمل کی تو ایمان اسے حیرت سے دیکھے گئی۔ پھر یکدم ہی اس کے لبوں پر ایک مدھم مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔اس نے سر جھٹک کر چہرہ کھڑکی کی جانب پھیرتے ہوئے مسکراتے لہجے میں دھیرے سے کہا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"،اور ثمرین مسکرا کر شکریہ کہتی اپنی جانب والی کھڑکی کی طرف منہ موڑ گئی تھی۔ بہادر بھائی اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور پھر بیک ویو مرر میں ایک نظر ان دونوں کو دیکھ کر اگنیشن میں چابی گھمائی۔

"بی بی آپ لوگوں کو کچھ کھانا ہے؟"،انہوں نے نہایت نرمی و شفقت سے کہتے ہوئے اسٹیئرنگ وہیل ہلکا سا گھما کر گاڑی زن سے آگے بڑھائی تھی۔

"اپنے پیسوں سے کھلا رہے ہیں تو ہاں بہت تیز بھوک لگی ہے۔ ورنہ میں تو ابھی ناشتہ کر کے ہی آئی ہوں۔"، ثمرین نے مزے سے لٹ کو انگلی میں لپیٹتے ہوئے کہا تو ایمان اور بہادر بھائی کا

قہقہہ بے ساختہ تھا۔ یہ بھی پوری نمونی تھی۔ بہادر بھائی نے سر جھٹک کر ڈرائیونگ کرتے ہوئے مسکرا کر سوچا تھا۔

"بی بی نے دیے ہیں پیسے کہ آپ لوگوں کو کچھ کھلا پلا دوں۔ اب یہ بتائیں کہ ابھی کھلا دوں یا واپسی پر؟"

"ابھی یونیورسٹی چل لیں۔ واپسی پر کھالیں گے۔"، ایمان نے ثمرین کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا تو ثمرین کو چپ سی لگ گئی۔ پھر وہ منہ پھولاتی چہرہ کھڑکی کی جانب موڑ گئی تھی۔ ثمرین کی عمر لگ بھگ ایمان جتنی ہی تھی۔ اس کا ابھی حال ہی میں انٹر مکمل ہوا تھا اور اب وہ بھی ایمان کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں داخلہ لے رہی تھی۔ ثمرین بہت چھوٹی تھی جب وہ رمیص کی سرپرستی میں آئی تھی۔ رمیص اس کے والد کا دور کا رشتے دار تھا۔ ثمرین کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور ماں فالج زدہ تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا تو رمیص اسے اور اس کی ماں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کے رمیص کے ہاں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔

www.novelsclubb.com

تب وہ پوری طرح سے اسی کی سرپرستی میں آگئی۔اس کے تمام اخراجات کی ذمّے داری رمیص نے اپنے کاندھے پر لے لی تھی۔ گاؤں میں اس کی خالہ رہا کرتی تھیں جن کے پاس وہ ہر کچھ عرصے میں ملنے جایا کرتی تھی۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اس کی خالہ نے اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ ثمرین کی رضامندی تھی ورنہ رمیص اس رشتے کے لیے راضی نہ تھا۔ خیر، نسبت طے کر دی گئی اور شادی کا فیصلہ بعد کے لیے رکھا گیا۔

البتہ غزل نے صاف لفظوں میں اسے جتا دیا تھا کہ وہ اس کی گریجوئیشن ہونے سے پہلے اس کی شادی کسی صورت نہیں کرے گی، سو اب وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے رہی تھی۔ ایمان سے بھی اس کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ہم عمر تھی۔ انڈرسٹینڈنگ ہونا فطری تھا۔

وہ یونیورسٹی پہنچے تو دور سے ہی یونیورسٹی کے گیٹ کے پار اسے اپنا منگیتر کھڑا نظر آ گیا۔ وہ سنجیدہ سے نقوش کا مالک تقریباً اکیس بائیس سال تک کا لڑکا تھا۔ سادہ سے بھورے رنگ کے بے داغ شلوار قمیص زیب تن کیے وہ دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے، سر اٹھائے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ ثمرین اسے دیکھ کر مسکرائی تو وہ بھی جواباً مسکرا دیا۔ ایمان اگلی جانب کا دروازہ کھولے باہر نکلی تو ثمرین

دوڑتی ہوئی پرجوش انداز میں اس کی جانب آئی اور اسے زور سے بازو سے تھاما۔ایمان نے بوکھلا کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟"، وہ نا سمجھی سے پوچھ رہی تھی۔

"ایمان۔۔۔وہ۔۔۔"، ثمرین نے انگلی سے اس جانب اشارہ کیا تھا جہاں وہ کھڑا اسے ہلکا سا مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ایمان نے فوراً اس رخ پر دیکھا اور پھر سوال آنکھوں میں لیے اسے چہرہ موڑے دیکھنے لگی۔اب کے ثمرین بھی چہرہ پھیرے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔"وہ جبران ہے۔ میرا منگیتر۔"

اور ایمان کے لب بے ساختہ ہی اوہ کی سی صورت گول ہوئے تھے۔اس نے اپنا بازو اس کے ہاتھوں سے چھڑواتے ہوئے اس کے شانے کے گرد بازو پھیلایا تھا اور ہلکا سا اس کے کان کے پاس جھک کر گویا ہوئی تھی۔

"ہوں۔۔۔اچھا ہے۔۔۔ مگر تم سے کم۔"، اور اس پل ثمرین نے لب دانتوں تلے دبا کر اپنی شرم پر قابو پایا تھا۔بہادر بھائی گاڑی ڈرائیو کرتے پارکنگ لاٹ میں لے گئے تھے۔ پیچھے وہ

دونوں ساتھ ہی اندر کی جانب بڑھی تھیں۔ابھی ان دونوں نے گیٹ کے پار قدم دھرا ہی تھا کہ جبران اپنے دوستوں سے معذرت کرتا قدم ان کی جانب بڑھ آیا تھا۔

"السلام علیکم۔"،اس نے سر ہلکا سا جھکا کر ان دونوں کو سلام کیا تو دونوں نے اسے سلام کا جواب دیا۔

"کیسی ہو؟"،اب وہ ثمرین کی جانب ہلکا سا جھکے،ابرو اٹھاتے اس سے مسکراتے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ثمرین شرم سے سرخ ٹماٹر ہوئی تھی۔پھر ہلکا سا گلا کھنکارے اس نے جواباً مدھم لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک۔آپ کیسے ہیں؟"،ایمان اس کے انداز ہی دیکھتی رہ گئی تھی۔اف یہ کتنی بڑی ڈرامے باز تھی۔اس نے سر جھٹکا تھا۔

اب کے وہ دونوں سرگوشیوں میں بات چیت کرنے میں مصروف تھے۔ایمان کو اپنا آپ وہاں نہایت فالتو لگ رہا تھا۔وہ بہت ہی آکورڈ سی ہوئی دور یونیورسٹی کی اونچی عمارت کو دیکھنے لگی تھی۔ جبھی ثمرین اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

www.novelsclubb.com

"ایمان۔"

"ہوں؟"، اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ دونوں اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ثمرین مسکرائی تھی۔

"یہ جبران ہے، میری خالہ کا منگیتر۔۔۔ میرا مطلب ہے میرے بیٹے کی خالہ۔"، اف! اس نے زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ ایمان مسکراہٹ بمشکل روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبران بھی لب دانتوں تلے دبائے چہرہ جھکا گیا تھا۔ ثمرین خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔ ایمان بہت ہی مشکلوں سے اپنا قہقہہ روکنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ جبران کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔

"یہ جبران ہے۔۔۔ میرا منگیتر۔ میری خالہ کا بیٹا۔"، اور اب کے اس نے آنکھیں بند کر کے تیزی سے اپنی بات مکمل کر کے آنکھیں کھول کر باری باری ان دونوں کو دیکھا تھا۔ ایمان کا چہرہ دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کس مشکل سے اپنی ہنسی روکے ہوئی ہے۔ البتہ جبران کا چہرہ جھکا ہوا تھا تو اس کی مسکراہٹ نظر نہ آتی تھی۔

"صحیح بولا ہے اس بار۔"، تبھی جبران نے چہرہ اٹھا کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اس نے

سکھ کا سانس لیا۔ البتہ ایمان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ ثمرین نے اس کے شانے پر چپت رسید کی تو وہ مزید زور سے ہنس پڑی۔

"ایمان، عائشے گل کہتی ہے کہ اچھی لڑکیاں زور سے قہقہے لگا کر نہیں ہنستیں۔"، وہ اب اس کا بازو تھامتے آگے بڑھتے ہوئے ڈپٹتے ہوئے بول رہی تھی۔ جبران بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی پشت پہ ہاتھ باندھے آ رہا تھا۔ ایمان ایک بار پھر ہنسی تھی۔

"ثمرین، تم سے کس نے کہا کہ میں اچھی لڑکی ہوں؟"، ایمان نے بمشکل اپنی ہنسی کو قابو کرتے ہوئے پوچھا تو ثمرین نے مایوسی سے سر نفی میں ہلایا۔

"بہت بری بات ہے۔ عائشے گل کہتی ہے کہ کوئی لڑکی بری نہیں ہوتی۔ بس ان سے کبھی کبھی کوئی کام برا ہو جاتا ہے۔"، اور اس بات پر ایمان نے نا سمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ عائشے گل کون ہے؟"، اور اب کے ثمرین کی آنکھیں صحیح معنوں میں پھیلی تھیں۔ اس نے بہت ہی حیرت اور بے یقینی سے اسے چہرہ موڑ کر دیکھا تھا۔

"تمہیں یہ نہیں پتا کہ عائشے گل کون ہے؟"، ایمان نے سر نفی میں ہلایا تھا۔ ثمرین کو تو جیسے غم

ہی لگ گیا تھا۔اس کی پسندیدہ ناول کریکٹر اور اس لڑکی کو یہ ہی نہیں پتا تھا کہ عائشے گل کون ہے۔

"تم سیریئس ہو،ایمان؟"،ایمان نے اس بار سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"یہ اتنی مشہور ناول کا کردار ہے،ایمان۔جنّت کے پتّے نام تو سنا ہوگا ناں؟"،اور اب کے ایمان نے کچھ پر سوچ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ہاں یہ نام تو اس نے سن رکھا تھا۔کہاں؟اسے یہ یاد نہیں تھا۔ارے ہاں!

"یاد آیا۔میری اسکول کی دوستیں ذکر کیا کرتی تھیں اس ناول کا۔بس وہیں سنا ہے۔کیوں؟"،

اب کے ثمرین نے قدم روکے تو اس نے بھی روک دیے۔پیچھے آتے جبران نے بھی بے ساختہ اپنے بڑھتے قدم روکے تھے۔

"عائشے گل اور اس کی باتیں اتنی خوبصورت ہیں ناں ایمان کہ کیا بتاؤں تمہیں۔۔۔اتنا کچھ سکھایا ہے عائشے نے مجھے کہ بس۔اس کی اچھی لڑکیوں کی باتیں۔اس کی حیا سے دوستی،اس کی بہارے کو نصیحتیں۔۔۔سب اتنی پیاری ہوتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔تم ناولز نہیں پڑھتی کیا؟تم نے

کبھی کوئی ناول نہیں پڑھی؟"، ایمان نے ایک گہرا سانس لے کر سر دھیرے سے نفی میں ہلایا تھا۔ چہرے پر افسردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اب کے جب وہ بولی تو آواز مدھم اور لہجہ نم تھا۔

"میرے ابو نے کبھی ناولز پڑھنے کی اجازت ہی نہیں دی مجھے۔ کہتے تھے کہ دماغ خراب کرتی ہیں یہ ناولز لڑکیوں کا۔"، اور یہاں ثمرین کے اندر کی ناول زادی پھڑپھڑائی تھی۔ ایسے کیسے کوئی اس کی ناولز کے بارے میں یہ کہہ سکتا تھا؟ جبران بغور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ ملاحظہ کر رہا تھا۔

"ناولز بہت سبق آموز ہوتی ہیں، ایمان۔ ہر ناول فحاش نہیں ہوتی۔ انسان انسان کی بات ہوتی ہے۔ چوائس چوائس کی بات ہوتی ہے۔ مصنف مصنف کی بات ہوتی ہے۔"، وہ کیسے سن لیتی یہ الزامات اپنی بیچاری ناولز پر؟ اس کی تو ناولز کی دیوانی روح اس بہتان پر بلبلا اٹھی تھی۔

"جانتی ہوں۔۔۔ خیر چھوڑو میرے ابو کو۔ چلو اندر۔"، اب کے اس نے ثمرین کو بازو سے تھامتے اپنے ساتھ آگے گھسیٹا تو جبران بھی چل پڑا۔ یونیورسٹی کی اونچی سرمئی عمارت کی

سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے ثمرین نے ایک بار پھر اسے چہرہ موڑ کر دیکھا تھا۔

"میرے پاس بہت ساری ناولز کی کتابیں ہیں۔ تم کو دوں گی۔ پڑھنا۔ صحیح ہے؟"، ایمان نے سر اثبات میں ہلایا تو وہ مسکرا دی۔ جبھی پیچھے سے گلا کھنکارنے کی آواز پر وہ دونوں ہی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے رک گئیں۔ چہرہ موڑ کر دیکھا تو جبران ثمرین کو دیکھ رہا تھا۔

"ثمرین۔۔۔ وہ مجھے تم سے پوچھنا تھا کہ تمہاری عائشے گل صرف اچھی لڑکیوں کے بارے میں ہی بتاتی ہے کیا؟ اچھے لڑکوں کا کیا؟"، اس کا انداز اتنی معصومیت لیے ہوئے تھا کہ ایمان نے بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر روکی تھی۔ ثمرین ایک بار پھر سرخ ہوئی تھی۔

"نہیں۔"، کہہ کر وہ ایمان کے ساتھ ہی دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

"مگر پھر ہم اچھے لڑکوں کا کیا ہو گا؟"، وہ منہ پھولائے اسے تنگ کرنے کو بولتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

"اچھے لڑکوں کو چاہیئے کہ اپنے لیے کوئی اور ناول لکھ لیں۔"، وہ بغیر پیچھے مڑے بولتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ایمان بھی ہنستی ہوئی اس کے ساتھ ہی چل رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

'لو بھلا۔ یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا۔"، جبران سینے پہ بازو لپیٹتے بولا تو ثمرین نے دانتوں تلے زبان دبائی۔

"انصاف تو ہے۔"، وہ بولی تو اب کی بار جبران نے مسکراتے ہوئے چپ رہنے پر اکتفا کیا تھا۔

ایمان بھی سر جھٹکتے ہوئے ہنستی اس کے ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

منظر کراچی کے ایک جدید طرز پر بنے ریسٹورنٹ کا ہے۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی مگر آج کل سردی گرمی سا، دھوپ چھاؤں سا موسم تھا سو دھوپ اتنی تپش نہیں لیے ہوئے تھی۔ آسمانی نیلے اور سفید رنگ کے امتزاج کا یہ حسین سا ریسٹورنٹ اس وقت لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سفید و سیاہ یونیفارمز میں ملبوس بیرے ہاتھوں میں ٹرے تھامے ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر جاتے نظر آتے تھے۔

ایسے میں ایک جانب بنی اونچی سی گلاس وال کے ساتھ رکھی میز کے گرد وہ دونوں بیٹھی تھیں۔

www.novelsclubb.com

ایمان اور ثمرین۔ایک دوسرے کے مقابل بیٹھی وہ دونوں مسکراتی جا رہی تھیں۔ایمان سر ہلاتی مسکراتے ہوئے ثمرین کی کوئی بات سن رہی تھی۔گلاس وال سے میٹھی سی دھوپ چھن کر ان دونوں پر آ رہی تھی۔دھوپ میں ایمان کی گندمی رنگت دمک سی رہی تھی۔ذرا قریب جا کر دیکھا جاتا تو ان کی آوازیں اور باتیں واضح ہوتیں۔

ثمرین صاحبہ ایمان کو جنّت کے پتےّ کی کہانی سنا رہی تھیں۔ایمان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بتاتے تھے کہ اسے واقعی یہ ناول خوب دلچسپ لگی ہے۔وہ چمچ سے پاستا منہ میں رکھتی، ہلکا سا جھکے اسے سن رہی تھی۔بہادر بھائی کو ان دونوں نے اندر آنے کو کہا تھا مگر انہیں ایسی جگہوں پر جانے کی عادت نہیں تھی سو وہ باہر گاڑی میں ہی بیٹھے تھے۔

جبھی ثمرین کی باتیں سنتے سنتے ایمان کے ہاتھ میں تھامے چمچ میں موجود پاستا قمیض بوس ہوا تھا۔۔۔ہاں قمیض بوس ہی تو ہوا تھا! وہ یکدم ہی کسی ٹرانس سے باہر آئی تھی۔چہرہ جھکا کر اپنی قمیض کے آنچل کو دیکھا تو الجھن سی ہوئی۔اف! اب اٹھ کر واش روم تک جانا پڑے گا۔

"اچھا ثمرین۔کہانی یہیں پاز کرو۔میں اپنی قمیض سے نشان صاف کر کے آؤں۔اتنا لائٹ کلر

ہے۔داغ ہی نہ پڑ جائے۔"، وہ بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو ثمرین بھی سمجھ کر سر ہلاتی اپنی پلیٹ سے کھانا کھانے لگی۔

چند منٹوں بعد ایمان واش روم سے نکلتی، چہرہ جھکائے قمیض جھاڑتی آگے بڑھتی جا رہی تھی جب یونہی اس کی نگاہیں اٹھ کر پھر جھکی تھیں۔اور پھر یکدم ہی اس نے ایک جھٹکے سے چہرہ اٹھایا تھا۔سامنے چند میزیں چھوڑ کر اس ہی کی جانب چہرہ کیے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ عمر لگ بھگ ایمان کے ہی جتنی تھی۔ گوری صاف رنگت والی، سبز خوبصورت آنکھوں والی۔

جامنی رنگ کی فراک کے ساتھ سفید ٹائٹس اور سفید ہی اسٹالر سر کے گرد لپیٹے وہ اپنے سامنے بیٹھی کسی لڑکی سے محو گفتگو تھی۔ایمان اسے پہچان گئی تھی۔ وہ اسے پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔اسے پہچاننے میں غلطی ایمان سے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔اور ایمان یوں بھی برے وقتوں کے ساتھیوں کو اچھے وقتوں میں بھلانے والوں میں سے نہ تھی۔

وہ میرال تھی۔اس کی میرو۔اس کی بچپن کی پکی سہیلی۔ وہ کیسے نہ پہچانتی اسے؟ وہ تو آج بھی روز

رات کو ان دنوں کو یاد کر کے سوتی تھی۔ تو ان دنوں کی ساتھی کو کیونکر بھول جاتی؟ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں وہ قدم قدم چلتی اس تک جانے لگی تھی۔ وہ ابھی اس سے کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر تھی کہ میرال کی نظریں یونہی اٹھی تھیں۔۔۔اور پھر جھکنا بھول گئی تھیں۔ ہاتھ میں تھاما فورک بے دم سا پلیٹ میں گر گیا تھا۔ منہ بے اختیار ہی کھل گیا تھا۔ آنکھیں پھیلتی چلی گئی تھیں۔

وہ اسے پہچان گئی تھی۔ وہ اسے واقعی پہچان گئی تھی؟

میرال کے لب دھیرے دھیرے کسی لفظ میں ڈھلتے چلے گئے تھے۔

"ایمان؟"، اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایمان کو یوں اتنے عرصے بعد ایسے اپنے سامنے کراچی میں دیکھنے کا تصور بھی اس نے نہیں کیا تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی۔ ایمان کو واضح طور پر اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی نمی ابھرتی نظر آئی تھی۔ اس کی خود کی آنکھیں کون سی سوکھی تھیں۔ نمی ان میں بھی در آئی تھی۔ اس کے قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ آنکھیں اب بھی میرال کے چہرے پر جمی تھیں۔

وہ ویسی ہی تھی۔ بالکل نہیں بدلی تھی۔ بالکل بھی نہیں! ایمان آخری بار اس سے ڈھائی سال پہلے ملی تھی، روحان کے نکاح پر۔ اب وہ اسے ڈھائی سال بعد دیکھ رہی تھی۔۔۔ وہ بھی یوں، یہاں کراچی میں؟

اس نے میرال کو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتا دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میز کے پار سے نکلی تھی۔ اب وہ اس کی جانب چلی آرہی تھی۔ درمیان میں چند ہی تو قدم تھے تو وقت اتنا کیوں لگ رہا تھا؟ ہاں مگر درمیان میں ماہ و سال بھی تو حائل تھے۔ درمیان میں کئی شکوے بھی تو حائل تھے۔ درمیان میں کئی آنسو بھی تو حائل تھے۔

اس کی طرف بڑھتی میرال اب آنسوؤں کے پار دھندلاتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ وہ کس ضبط سے خود کو کنڑول کیے ہوئی تھی، یہ وہی جانتی تھی۔ اور پھر کچھ دوست ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے لیے آنسو بہانا جائز ہوتا ہے، مگر پھر ایسے دوست آنسو بہانے بھی تو نہیں دیتے۔

میرال ایمان کے عین سامنے کھڑی اسے تک رہی تھی۔ایمان کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹتے ہوئے رخساروں پر بہہ چلے تھے۔وہ آنسو بہت خاموش سے تھے۔خاموشی سے بہتے چلے جارہے تھے۔

"ا۔۔السلام علیکم۔"، سلام میں پہل میرال نے کی تھی۔ایمان نے اب کے ایک گہرا سانس لے کر رخسار رگڑ ڈالے تھے، پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتی ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"وعلیکم السلام۔"،اس نے مسکرا کر جواب دیا تو میرال بھی ہلکا سا مسکرا دی۔

"کیسی ہو؟"، میرال نے اگلا سوال کیا تو ایمان کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔کیا وہ اس لڑکی سے جھوٹ بول سکتی تھی؟اور بول بھی لیتی تو کیا ایسا ممکن تھا کہ یہ سبز آنکھیں دھوکہ کھا جائیں؟

"ٹھیک نہیں ہوں۔"،ایمان جب بولی تو آواز بہت مدھم،بہت دھیمی تھی۔اتنی کہ بمشکل میرال کی سماعتوں تک پہنچ سکے۔میرال نے اس کے جواب پر اسے ایک نظر دیکھا تھا۔اس ایک نظر میں ڈھیر سارا شکوہ،ڈھیر ساری شکایات درج تھیں۔شکایتوں کی ایک لمبی نہ ختم ہونے والی

فہرست تھی۔ میرال نے لب دبا کر خود کو رونے سے باز رکھا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اگلے پل زور سے اس کے گلے آلگی تھی۔ ایک جھٹکے سے اس نے اسے گلے لگایا تھا۔ ایمان کی آنکھیں گلابی پڑنے لگی تھیں۔ اپنے بازو اس کے گرد باندھے اس نے اپنا چہرہ اس کے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ میرال نے بھی یہی کیا تھا۔ وہ اب دھیرے دھیرے ایمان کی پشت سہلا رہی تھی۔

"بڑی بری ہو تم۔"، وہ بہتے آنسوؤں کے درمیان کہتی جا رہی تھی اور ایمان سر ہلاتی اس کے شکوے کو قبول کرتی جا رہی تھی۔ آس پاس کون انہیں دیکھ رہا تھا، کون نہیں۔۔۔ انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی۔

"سو تو ہے۔"، ایمان اس کے کان کے پاس دھیمی آواز میں بولی تو میرال نے ایک جھٹکے سے اسے شانوں سے تھامے خود سے دور کیا تھا۔ ایمان اس کے جلال پر ایک پل کو روتے روتے ہنس دی تھی۔ میرال کا یہ انداز آج بھی بدلا نہیں تھا۔

"شرم نام کی چیز ہے تم میں؟"، اس نے غصّے سے پوچھا تو ایمان نے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہی سر نفی میں ہلایا تھا۔

"شرم کیا ہوتی ہے؟"، شانے اچکا کر نہایت لاعلمی سے پوچھا گیا تو میرال نے ایک گہرا سانس لے کر اس کے گال پر چپت لگائی۔

"وہی جو تم میں نہیں ہے۔"، اب کے وہ بولی تو ایمان سر جھکائے آنسو پونچھتے پونچھتے ہی ہنس پڑی۔

"بڑی اچھی طرح جانتی ہو تم مجھے۔"، ایمان ہنستے ہوئے بولی تو میرال نے بھی سر اثبات میں ہلا دیا۔

"بالکل۔"، بولتے ہوئے وہ اپنی میز کے ساتھ کرسی لگائے بیٹھی لڑکی کی جانب مڑی۔

"سماویہ، یہ ایمان ہے۔ایمان عرف مونی۔میری بچپن کی دوست۔"،اس نے تعارف کروایا تو سماویہ کی آنکھوں میں مسکراہٹ سی اتری۔وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اچھا تو یہ ہے مونی۔۔۔سو گڈ ٹو میٹ یو، ایمان۔"، اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تو ایمان نے بھی مسکرا کر ہاتھ تھام لیا۔"ہر وقت میرال کی زبان پر آپ کا ہی نام ہوتا ہے۔آپ لوگ ایک دوسرے کو کیا کہتے تھے،ایک دوسرے کے ساتھ کیا کھیلتے تھے،آپ کا

پسندیدہ کلر، پسندیدہ کارٹون، پسندیدہ کھیل، پسندیدہ جگہ۔۔۔سب حفظ کروادیا ہے مجھے میرال نے۔"

وہ مزے سے مسکرا کر بولی تو ایمان کھلکھلا کر ہنس دی۔ہاں اسے میرال سے اسی بات کی توقع تھی۔

"مونی، یہ سماویہ ہے۔میری یونیورسٹی فیلو۔"،میرال نے مسکرا کر سماویہ کا تعارف کروایا تو ایک پل کو ایمان ٹھہر سی گئی۔کیا میرال نے اسے مونی کہا؟ کیا اب بھی کوئی اسے مونی کہہ سکتا تھا؟ پھر سر جھٹک کر ہلکے سے مسکرائی۔

"نائس ٹو میٹ یو۔"،اس نے سماویہ سے مصافحہ کر کے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔سماویہ بھی مسکرائی تھی۔جبھی پاس میز پر پڑا فون بجنے لگا تو سماویہ نے ایک پل کو مڑ کر فون کی اسکرین کو دیکھا۔پھر ہاتھ بڑھا کر کال پک کر کے فون کان سے لگا یا۔

"ہیلو۔۔۔جی بابا؟۔۔۔اچھا اچھا اوکے۔۔۔جی جی میں آتی ہوں۔"، بولتے ہوئے اس نے کال

کاٹ کر فون ہاتھ میں تھامے مڑ کر میز پر پڑا اپنا پرس اٹھایا۔

"اچھا میرال۔۔۔ بابا پک کرنے آ گئے ہیں۔اب میں چلتی ہوں۔ سی یو ٹو مورو۔"، وہ بولتے ہوئے میرال سے گلے لگ کر باہر کی جانب بڑھ گئی تو میرال اب کے فرصت سے اس کی جانب مڑی۔

"تم سناؤ۔ تم یہاں کراچی میں کیسے ؟اور ادھر کس کے ساتھ آئی ہو ؟"،اس نے پوچھا تو ایمان کی آنکھوں میں تلخی سی نمایاں ہوئی۔لبوں پر ایک درد بھری مسکان دوڑی تھی۔ذہن کے پردوں پر گزرے مناظر کسی فلم کی مانند چلے تھے۔

"بہت لمبی کہانی ہے۔سنانے بیٹھی تو صبح سے رات ہو جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ صبح سے اگلی صبح بھی ہو جائے تب بھی میں سنوں گی۔"،اس نے مسکرا کر جواب دیا تو ایمان بھی ہلکا سا مسکرا دی۔

"تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو۔ پھر کل پلان بناتے ہیں کہیں ملنے کا۔"، وہ مسکرا کر بولی تو میرال ناسمجھی سے اس کے کچھ قریب آئی۔

"یہاں کس کے ساتھ آئی ہو؟"

"یہ تو تمہیں ابھی سمجھ نہیں آئے گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ ایک بہت ہی پیاری لڑکی کے ساتھ آئی ہوں جو میری بہت ہی اچھی دوست بھی ہے۔ وہ رہی۔"، اس نے دور میرال کے پیچھے اشارہ کر کے کہا تو میرال نے بے ساختہ ہی سر موڑا۔ سامنے بیٹھی ثمرین نے بھی اتفاقاً ہی اسی وقت چہرہ پھیر کر ادھر دیکھا تھا۔ ایمان کو اس کے ساتھ کھڑا دیکھ کر اس کے چہرے پر تھوڑی ناسمجھی بھرا سوال ابھرا تھا۔ ایمان نے اسے دو انگلیوں سے ادھر آنے کا اشارہ کیا تو وہ سر ہلاتی اٹھ کر اس کی جانب بڑھ آئی۔

"ثمرین۔۔۔ اس سے ملو۔ یہ میری بچپن کی سہیلی، میرال ہے۔ میرال، یہ ثمرین ہے۔ میری بہت ہی کیوٹ اور فنی سی دوست۔"، ہائے ہیلو کے بعد ایمان میرال سے اس کا نمبر لیتی، اس کے ساتھ ہی باہر نکلتی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی تھی۔ بہادر بھائی گاڑی کے باہر کھڑے، گاڑی سے ٹیک لگائے ان دونوں کے ہی منتظر تھے۔ میرال کی گاڑی بھی ان کی گاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔ اندر اس کا ڈرائیور بھی بیٹھا ہوا تھا۔

www.novelsclubb.com

ایک آخری بار اللہ حافظ کرتیں وہ دونوں اپنے اپنے راستوں پر گامزن ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچیں تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ البتہ موسم کی وہ منفرد سی تازگی اس خزاں میں بھی نجانے کیسے محسوس ہو رہی تھی۔ آسمان کا رنگ اب کچھ گہرا نیلا سا ہو گیا تھا۔ صبح کے وقت سفید نظر آنے والے بادل اب گہرے سرمئی رنگ کے لگنے لگے تھے۔ آسمان مغرب کی جانب سے ہلکا نارنجی پڑنے لگا تھا۔ اسی نارنجی تالاب میں سورج کسی گول ٹکیا کی مانند چمکتا گہرا نارنجی سا ہو رہا تھا۔

رمیص جہانزیب کے گھر میں بھی چائے کا دور چل رہا تھا۔ وہ سوئمنگ پول ایریا میں کرسیوں پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھیں، چائے کے دوران باتیں کرنے میں مصروف نظر آتی تھیں۔ درمیان کی میز پر کیتلی اور چینی کی پیالی کے ساتھ ایک خالی کپ بھی رکھا ہوا تھا۔ ثمرین ارحم کو ٹیوشن سے پک کرنے گئی تھی، تو اس کی نشست بھی خالی تھی۔

www.novelsclubb.com

ایمان انہی صبح والے کپڑوں میں ملبوس تازہ دم سی لگ رہی تھی۔اس کے مقابل بیٹھی غزل ہلکے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس، سر پر پرنٹڈ سبز دوپٹہ اوڑھے، بہت غور سے ایمان کے کھلے کھلے سے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کپ لبوں سے لگا رکھا تھا۔ایمان جب سے یہاں آئی تھی، تب سے اب تک یہ پہلی دفعہ تھا کہ غزل کو اس کے چہرے پر یہ تازگی اور چمک دیکھنے کو ملی تھی۔

"آج یونیورسٹی میں دن کیسا رہا؟"،اس نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے پوچھا تو ایمان مسکرا دی۔

"فارم فل کر آئے ہیں۔اچھی لگی مجھے تو یونیورسٹی۔ہر لحاظ سے اچھی تھی۔اب دیکھیں اللہ نے کیا سوچ رکھا ہے ہمارے لیے۔"،اس نے اپنی چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے تفصیل سے بتایا تو غزل سمجھ کر سر ہلانے لگی۔

"جبران سے ملاقات ہوئی تھی تم لوگوں کی؟"،اب کے اس نے پوچھا تو بے اختیار ہی ایمان کی آنکھوں کے آگے ثمرین کا تپا ہوا چہرہ لہرایا۔ایک مسکراہٹ سی اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

پھر اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ غزل کو دیکھا۔

"ہاں ہوئی تھی ملاقات۔"

"ثمرین سے زیادہ فری تو نہیں ہو رہا تھا؟"، اس نے اگلا سوال پوچھا تو ایمان نے مسکرا کر سر نفی میں ہلا دیا۔

"بالکل بھی نہیں۔ بہت سلجھا ہوا، ڈیسنٹ سا لڑکا ہے۔ ہاتھ باندھے ہمارے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔۔۔ہاں ایک دو بار ثمرین کو اس کی ناولز پر باتیں سنائیں تو وہ تپ گئی تھی۔"، اس نے بات مکمل کی تو غزل نے پر سوچ انداز میں آنکھیں سکیڑیں۔

"یہ گائیڈ وہ تم لوگوں کو کر رہا تھا یا تم لوگ اسے کر رہی تھیں؟ پیچھے کیوں چل رہا تھا وہ؟"، اسے واقعی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس کے سوال پر ایمان قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔

"کیونکہ ہم اسے آگے آنے دے ہی نہیں رہے تھے۔ ثمرین گولی کی رفتار سے چل رہی تھی اور مجھے بھی اس کے ساتھ چلنا پڑ رہا تھا۔"، اس نے بات مکمل کی تو غزل بھی سر جھٹک کر مسکرا دی۔ یہ ثمرین کبھی نہیں سدھر سکتی تھی۔

"اور تم سناؤ۔۔۔اچھا لگا تمہیں کراچی؟"، اس نے اب کے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر کپ

میز پر دھرتے ہوئے اس سے پوچھا تو ایمان نے ہلکا سا مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہاں اچھا ہے۔ اچھا لگا مجھے کراچی۔۔۔ اچھا غزل۔۔۔ دراصل مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"، اب کے ایمان نے بھی اپنا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا تو غزل نے سر ہلا کر گویا بات جاری رکھنے کا عندیہ دیا۔

"ہاں کہو۔"

"آج مجھے ریسٹورنٹ میں اپنی بچپن کی دوست ملی۔ میری بیسٹ فرینڈ۔ میں نے اس کے ساتھ ملنے کا پروگرام بنایا ہے کل اسی ریسٹورنٹ میں۔ آپ بہادر بھائی سے کہہ دیں گی کہ مجھے ڈراپ کر دیں؟"، اس نے غزل کو بتایا تو غزل ناسمجھی سے ہلکا سا مسکرا دی۔

www.novelsclubb.com

"ہاں وہ سب تو صحیح ہے مگر کراچی میں تمہیں کیسے دوست مل گئی اپنی؟ تم تو حیدرآباد سے ہو۔"

"جی اصل میں اس کے ابو کی پوسٹنگ ہوتی رہتی ہے ناں۔ چند سالوں پہلے ان کی پوسٹنگ اسلام آباد ہو گئی تھی۔۔۔ پھر ابھی ایک ہی سال پہلے وہ ریٹائر ہو گئے تو ان کی فیملی یہیں کراچی شفٹ ہو گئی۔ ان کا ددھیال اور ننھیال یہیں ہے۔"، غزل نے پوری بات سن کر سر ہلایا تھا، پھر یکدم

ہی سر سیدھا کر کے اسے دیکھا تھا۔

"تم یوں کیوں نہیں کرتی کہ اسے گھر بلا لو۔اس کی اچھی سی دعوت کرتے ہیں۔میں بھی گھر پہ رہ کر بہت بور ہو جاتی ہوں۔میرا بھی دل لگ جائے گا تھوڑا۔"،اور ایمان نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

"آر یو سیریئس،غزل؟کیا واقعی بلا لوں اسے یہاں؟"،اس کے پوچھنے پر غزل نے فوراً سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ہاں بالکل۔"

"اس سے اچھا تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔میں اس کو کال کر یہاں آنے کا کہہ دوں گی۔۔۔"،وہ دل کھول کر مسکرائی تو غزل بھی مسکرا دی۔اسی پل مین گیٹ دھکیلتے ثمرین ارحم کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی۔ارحم کا ننھا سا ہاتھ تھام رکھا تھا اور ایک کاندھے پر اس کا چھوٹا سا بستہ لٹکا رکھا تھا۔وہ ان کی جانب ہی چلی آئی تھی۔جانتی تھی کہ وہ وہیں ہوں گے۔

"السلام علیکم۔"،ارحم ان دونوں کو وہاں دیکھتا زور سے سلام کرتا،ثمرین کا ہاتھ چھوڑتا ہوا

بھاگ کر غزل کی جانب آیا تھا۔ غزل نے بھی اسے ہلکا سا جھک کر گلے سے لگایا تھا۔ ایک سکون سا جسم میں دوڑ گیا تھا۔ ثمرین بھی مسکرا کر چلتی ہوئی بستہ اپنے پیچھے رکھتی، وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"ارحم کی ٹیچر کہہ رہی تھیں کہ آج ارحم نے بہت اچھا اچھا کام کیا ہے۔"، اس نے بیٹھتے ہوئے نہایت خوشی سے مسکرا کر بتایا تو غزل نے "واہ بھئی" والے انداز میں ارحم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر فخر سا دوڑ گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بازو سینے پہ لپیٹے اس نے ایک ادا سے ماں کو دیکھا تھا۔ غزل تو اس کے اس انداز پر صدقے واری جانے لگی تھی۔ ایسے کرتے ہوئے وہ بالکل چھوٹا رمیص لگتا تھا۔ ایمان نے بے اختیار ہی سوچا تھا۔ پھر وہ اپنے ہی خیال پر مسکرا دی تھی۔

ارحم ایک اور بار ماں کے گلے لگ کر دوڑ کر ایمان کے پاس چلا آیا تھا۔ ایمان نے فوراً ہی اپنی کرسی پر اس کے لیے جگہ بنائی تو وہ کود کر کرسی پر بیٹھے، پیچھے ٹیک لگا گیا۔ غزل کی مسکراہٹ ارحم کو دیکھتے تھمتی ہی نہیں تھی۔ وہ اسے جتنی بار دیکھتی، دل اتنی بار مسکراتا۔ اس کا بیٹا اس کی جان تھا۔ اس کی سانسیں اسی میں اٹکی ہوئی تھیں۔

"اور ثمرین۔۔۔ تمہاری خالہ کا فون آیا تھا میرے پاس۔"، غزل نے ثمرین کو دیکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا تو ثمرین کے چہرے پر ایک سرخی سی دوڑ گئی۔ بے اختیار ہی اس نے لب دانتوں تلے دبائے تھے۔

"کہہ رہی تھیں کہ ثمرین اور جبران کا نکاح کر دیتے ہیں۔ رخصتی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد ہو جائے گی۔"، وہ ثمرین کے لال ٹماٹر ہوتے چہرے کو بغور دیکھتی، مسکراہٹ دبائے کہتی جا رہی تھی۔ ایمان بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا کیا کہنا ہے اس بارے میں؟"، اس کے پوچھنے پر ثمرین نے یکدم ہی نگاہیں جھکائی تھیں، پھر بہت ہی باریک، ہلکی سی آواز میں دھیرے سے بولی تھی۔

"جو آپ کو بہتر لگے، باجی۔"، غزل کے لبوں پر ایک لمحے کو مسکراہٹ دوڑی تھی، مگر ثمرین کے دیکھنے سے پہلے ہی وہ مسکراہٹ چھپا گئی تھی۔

"میرا تو یہی خیال ہے کہ رمیص کی خواہش کے مطابق تم پہلے اپنی پڑھائی مکمل کرو اور پھر اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ لیا جائے۔"، اور ثمرین نے ایک جھٹکے سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ غزل

کا چہرہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔بے اختیار ہی اس نے ایمان کو دیکھا تھا۔وہ بھی اتفاق کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلا رہی تھی۔اس کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔اس نے گلا کھنکارا تھا اور پھر مدھم سی آواز میں دھیرے سے گویا ہوئی تھی۔

"میری امّاں مرحومہ کو بڑا شوق تھا میرا نکاح دیکھنے کا۔"،وہ کہتے ہوئے آنکھیں میچتے ہوئے سر جھکا گئی تھی۔غزل نے بہت ہی مشکلوں سے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا تھا۔ایمان کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔

"ہاں مگر تمہاری امّاں مرحومہ کی یہ خواہش بھی تو تھی کہ تم پڑھ لکھ کر کسی قابل بنو۔کسی مقام پر پہنچو۔"،غزل نے ٹکڑا لگایا تو ثمرین نے آنکھیں کھول کر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"جی وہ تو ہے۔۔۔مگر۔۔۔"،ابھی وہ مزید کوئی دلیل دیتی ہی کہ غزل منہ پر ہاتھ رکھتی زور سے ہنس پڑی تھی۔ایمان کا قہقہہ بھی ساتھ ہی چھوٹا تھا۔ارحم چھوٹی گول آنکھوں سے ان دونوں کو ہنستے ہوئے دیکھتا جا رہا تھا۔ایسے کون سی بات تھی جس پر اس کی مما اور ایمان آپی یوں ہنس رہی تھیں؟

"اف ثمرین۔ کتنا شوق ہے تمہیں شادی کا۔۔۔ سن لو میری بات۔ بہت چھوٹی ہو تم ابھی۔ کوئی شادی وادی نہیں ہو رہی ابھی تمہاری۔ کم از کم انیس بیس سال کی ہو گی ناں تبھی نکاح کروں گی تمہارا۔ تمہاری خالہ سے کہہ دیا ہے میں نے۔ نہ انہیں کوئی اعتراض ہے نہ ہی جبران کو۔"،

جب تک اس کی بات مکمل ہوئی، ثمرین کا کھلا کھلا سا چہرہ لٹک گیا تھا۔ منہ بھی پھولا لیا تھا۔ مسکراہٹ بھی غائب ہو چکی تھی۔ ایمان چہرہ جھکائے مسکراہٹ دبانے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ غزل بھی اب ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے، کہنی ہتھے پہ ٹکائے اسے دیکھ رہی تھی۔ ارحم اب بھی سب کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا اسے کہ سب کیا سوچ اور کر رہے ہیں۔

www.novelsclubb.com

☆☆☆

کراچی پر رات نے اپنے پر پھیلانا شروع کیے تو ہر شے گویا رات کی تاریکی میں نہا گئی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے تھے۔ ہوا بھی ہلکی ہلکی چلتی، ایک سکون سا دیتی تھی۔ ایسے میں رمیص جہانزیب کے گھر میں موجود ایمان کے کمرے میں جھانکا جاتا تو وہ بستر پر چت لیٹی نظر آتی۔

نگاہیں اوپر سیلنگ پر ٹکائے، وہ اپنی سوچوں کے محور میں تھی۔اس کی راتیں اب ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔

وہ سونے بارہ بجے لیٹتی تو آنکھ دو تین بجے لگتی۔اور یہ دو تین گھنٹے اس پر بھاری ترین ہوتے۔ فراغت ہی فراغت ہوتی۔اور فراغت تو ویسے بھی عذاب دہ ہوا کرتی ہے ناں! ہر تکلیف دہ لمحہ آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتا ہے۔وہ پہلے اپنا بچپن یاد کرتی تو دل سے خون رسنے لگتا۔ پھر مونی والے دن یاد کرتی تو اس کے دہکتے دل پر گویا ایک ٹھنڈی پھوار سی برستی۔پھر زاویار صاحب کے طعنے یاد کرتی تو آنکھیں پھر سے نم پڑنے لگتیں۔پھر آدم بھائی کی باتیں یاد کرتی تو نم آنکھوں سے ہی مسکرا دیتی۔

www.novelsclubb.com

وہ بہت بار سوچا کرتی تھی کہ آدم اس وقت کہاں ہوگا۔کیسا ہوگا۔ہوگا بھی کہ نہیں؟

آدم زاویار اس سے عمر میں بہت بڑا ہی سہی، مگر اس کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا۔اس کا ساتھی،اس کا مینٹور،اس کا سخت استاد۔جب وہ لڑکھڑا کر قدم ادھر ادھر کرتی تو وہ گدی سے

پکڑ کر اس کو سیدھا کھڑا کر دیتا۔ایمان کی آنکھوں کے آگے اس کا جوان، سنجیدہ سا چہرہ گردش کرنے لگتا۔اب وہ کیسا دکھتا ہو گا؟ شادی بھی کر لی ہو گی اس نے تو! اور شاید بچے بھی ہوں اس کے۔۔۔ایمان کو جب وہ یاد آتا تو اسے ساتھ رونا بھی آتا۔دل اس سے ملنے کا شدّت سے چاہتا۔

پھر وہ اپنے رشتے کی باتیں یاد کرتی تو حلق درد کرنے لگتا۔آنسو بصارت دھندلا دیتے۔ پھر ارتضی مراد کو سوچتی تو جیسے سوچوں کو ایک بریک سا لگ جاتا۔اس ایک شخص پر ایمان کی ساری دنیا رک جایا کرتی تھی۔اس پر تمام سوچوں کا اختتام ہو جایا کرتا تھا۔وہ اس کے ساتھ نہ ہو کر بھی اس کے خیالوں سے محو نہیں ہو پاتا تھا۔اس سے دور ہو کر بھی اس کے دل کے بالکل قریب رہا کرتا تھا۔۔۔اور پھر دل جسے اپنی اونچی مسند پر بٹھا لے،اسے مشکلوں سے ہی اتارا جا سکتا ہے۔چاہے آپ خود کو مصروف کر لو یا پھر خود کو سمجھا بجھا لو، یہ دل کسی کے قابو میں نہیں آیا کرتا پھر۔

اس کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کر رخساروں پر بہہ چلی تھی۔آنسو یکے بعد دیگرے گرتے اس کے تکیے میں جذب ہوتے چلے جا رہے تھے۔۔۔اور پھر کسی نے کہا ہے ناں کہ جتنے غم تکیوں نے سنے ہیں اتنے کسی انسان نے نہیں سنے۔جتنے غم ان تکیوں نے بانٹے ہیں، وہ کسی انسان کے

بس میں کہاں۔۔۔وہ تو بھلا ہو ان آنسوؤں کا جو بے رنگ ہوتے ہیں۔رنگ رنگ کے ہوتے تو نجانے کتنوں کے راز افشاں کر ڈالتے۔روز صبح تکیوں پر رنگ بکھرے نظر آتے اور دنیا جان جاتی کہ موصوف کل رات پھر سے اشک بہانے میں مصروف تھے۔

جبھی یکدم دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو ایمان حیران سی ہوئی۔رات کے اس پہر کون جاگا ہوا تھا؟اس نے بے اختیار ہی چہرہ گھما کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی گھڑی کو دیکھا تھا جو رات کے پونے دو بجا رہی تھی۔اور پھر وہ اپنے سرہانے سے دوپٹہ اٹھاتی شانوں پہ پھیلاتی پلنگ سے اتر کر دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

"کون ؟"،اس نے محتاط سے انداز میں پوچھا تھا۔

"میں ہوں۔۔۔ ثمرین۔"،اگلی جانب سے ثمرین کی آواز گونجی تو وہ حیران سی آگے بڑھی اور لاک گھما کر کھولا۔سامنے ہی ثمرین بالکل تیار سی کھڑی تھی۔باہر چند مدھم لائٹیں جلی ہوئی تھیں جن کی روشنی میں ثمرین نظر آرہی تھی۔پیلے رنگ کے قمیض شلوار میں ملبوس،خود کے گرد شال لپیٹے،وہ سر پہ کپڑوں کا ہم رنگ دوپٹہ جمائے،کاندھے پر پرس لٹکائے ہوئے تھی۔

www.novelsclubb.com

ایمان اچھنبے سے اسے دیکھے گئی تھی، جبکہ ثمرین اسے دیکھ کر کچھ پلوں کے لیے ٹھہر سی گئی تھی۔

"ایمان، تم ریڈی نہیں ہوئی؟"، اس نے جیسے بہت زیادہ حیرت سے پوچھا تھا۔ ایمان کو اس پر کسی پاگل دیوانی کا گمان ہوا تھا۔ اس نے نا سمجھی سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"کیوں؟ مجھے ریڈی ہونا تھا کیا؟"، ثمرین نے لب بھینچ کر اسے داہنے شانے سے تھاما تھا۔

"میری پیاری بہن۔ ہمیں نادرا آفس جانا ہے۔۔۔ بھول گئی کیا؟ باجی نے بتایا تو تھا تمہیں۔"،

اور ایمان کے ذہن میں یکدم ہی جھماکہ سا ہوا تھا۔ وہ کیسے بھول گئی اتنی اہم بات؟ اف!

"آہاں۔۔۔ یاد آگیا۔۔۔ تم ویٹ کرو میرا۔ میں بس دس منٹ میں باہر آتی ہوں۔"، وہ کہتے ساتھ ہی سوئچ بورڈ کی جانب بڑھی تھی اور اس پر ہاتھ مار کر بٹن آن کیے تھے۔ یکدم ہی تاریکی میں ڈوبا ہوا کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ وارڈروب کی جانب بڑھی تھی۔

دس ہی منٹ بعد وہ تیار سی اپنے کمرے سے نکلتی پورچ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ثمرین بھی اس کے آگے آگے ہی تھی۔ وہ موسم کے لحاظ سے ہلکے پھلکے سے لباس پر حسنہ کی دی ہوئی سنہری چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ایک نیلی رنگ کی فائل تھام رکھی تھی، جس میں اس کے تمام

ڈاکومنٹس موجود تھے۔وہ دونوں پورچ میں پہنچیں تو بہادر بھائی پہلے ہی گاڑی اسٹارٹ کیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے۔وہ دونوں تیزی سے پچھلی نشستوں کی جانب بڑھی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں گاڑی سڑک پر رواں دواں تھی۔رات کے اس پہر کراچی باقی شہروں کی نسبت کافی روشن تھا۔کافی دکانیں، کیفے اور جگہیں کھلی ہوئی تھیں۔ایمان جتنا حیران ہوتی،اتنا کم تھا۔ اسے بے اختیار ہی وہ رات یاد آئی تھی جب وہ روحان کے ساتھ حیدر آباد کے بس اڈّے پہنچی تھی۔اسے یاد تھا کہ اس رات حیدر آباد کی تمام سڑکیں بالکل سنسان سی تھیں۔اکادکا گاڑیاں ہی دیکھنے کو مل رہی تھیں۔اور آج یہ رات تھی جب وہ کراچی کی رونقیں دیکھ رہی تھی۔اسے واقعی حیرانی ہو رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

تھوڑا آگے جا کر وہ ایک موڑ مڑے تو سامنے ہی سڑک پر چھوٹا سا ہجوم نظر آیا۔بہادر بھائی نے کچھ آگے جا کر گاڑی روکی تو سامنے ہی ایک ایمبولنس کھڑی نظر آئی۔انہوں نے یکدم ہی گاڑی روک کر شیشہ نیچے کیا تھا۔ایمان اور ثمرین کا دھیان بھی پورا پورا باہر کی جانب ہی تھا۔بہادر بھائی نے پاس ہی کھڑے ایک آدمی کو آواز دی تو وہ مڑ کر ان تک چلا آیا۔

"کیا ہوا ہے یہاں ؟"، انہوں نے پریشانی سے سرمئی سڑک پر پڑے خون کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

اس آدمی نے ایک گہرا سانس لیا تھا اور پھر ذرا سا جھکا تھا۔

"لڑکے کا ڈمپر سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔"، ایمان اور ثمرین نے بے ساختہ ہی اپنے اپنے منہوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ دل کو کچھ ہوا تھا۔

"کیسا ہے لڑکا؟"، بہادر بھائی نے سر ہلکا سا جھکائے ایک نظر خون نم خون ہوئی سڑک کو دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ایکسپائرڈ۔"، آدمی نے افسوس سے سر ہلاتے جواب دیا تو بہادر بھائی کے چہرے پر بھی دکھ سا ابھرا۔

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔"، ان کی زبان سے بے اختیار ہی نکلا تھا۔ اور ایمان انہیں ٹھہر کر دیکھنے لگی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس کی بھی ایسی ہی عادت ہوا کرتی تھی۔ جب کبھی کسی کے انتقال کی خبر ملتی تو زبان سے سب سے پہلے یہی کلمات نکلتے تھے۔ اب اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ کنفیوژڈ ہو گئی تھی۔

www.novelsclubb.com

تبھی بہادر بھائی کی نظر ٹائم پر پڑی تو وہ اس آدمی سے چند آخری باتیں کہتے گاڑی آگے بڑھا لے گئے تھے۔یہی تو ہوتا ہے دنیا کا اصول۔یہی تو ہوتی ہے دنیا کی رفتار۔انسان دنیا سے گیا تو گویا زندگی سے گیا۔اور ہم اس دنیا کے ان لوگوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔اپنے اصل سے بے خبر۔اپنے مقصد کو فراموش کیے۔

اس کے بعد گاڑی میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ان دونوں میں سے کسی کا بھی کچھ کہنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔بہادر بھائی تو یوں بھی خاموش ہی رہا کرتے تھے تو ان کی خاموشی زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔مگر اچانک ہی گاڑی میں ان کی سنجیدہ سی آواز ابھری۔

"بیچارہ ڈیلیوری بوائے تھا۔"،ان کی آواز میں افسوس تھا۔وہ کہہ دیتے کہ لوگوں کو اس ٹائم پر احتیاط برتنا چاہیئے۔فضول میں آدھی رات کو گھر سے نکلنے سے گریز کرنا چاہیئے، مگر وہ یہ کیسے کہتے کہ انسان کو آدھی رات کو اپنے بال بچوں اور گھر والوں کا پیٹ بھرنے سے گریز برتنا چاہیئے؟

"غلطی ڈمپر والے کی بھی نہیں تھی۔وہ بھی اپنے روزگار کے لیے نکلا تھا اس وقت۔ غلطی

لڑکے کی بھی نہیں تھی کہ وہ بھی اپنی روزی کی تلاش میں نکلا تھا۔۔۔"،ایمان اور ثمرین سر جھکائے،افسوس سے انہیں سنے گئے تھے۔وہ صحیح کہہ رہے تھے۔

"غلطی حکومت کی ہے۔ غلطی ان سو کالڈ پلانرز کی ہے جنہیں ایکونومک پلاننگ کرتے وقت یہ بھول جاتا ہے کہ اس ایکونومی کا بڑا حصّہ لوگوں کے لیے وقف ہے۔ غلطی حکومت کی ہے۔ بڑے بڑے اداروں میں بیٹھے ان افسروں کی ہے جنہیں اتنی فرصت نہیں کہ ان بڑے ڈمپروں کے لیے الگ روٹ بنائیں۔ غلطی ان کی ہے اور بھگتتے عوام ہیں۔ناجائز نہیں ہے؟"، ان کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ایمان نے بیک ویو مرر میں نظر آتی ان کی بوڑھی نم آنکھوں کو دیکھا تھا۔ان بوڑھی آنکھوں میں بہت سی نمی پنہاں تھی۔اس کی اپنی آنکھیں بھی نم ہی تھیں مگر جو درد اور اذیت بہادر بھائی کی آنکھوں میں تھی،وہ الگ ہی تھی۔

"ہم کتنے بے بس ہیں ناں۔۔۔پاکستان کی یہ عوام کتنی بے بس ہے ناں۔اپنے اوپر ہوئے ظلم کے لیے بھی کچھ نہیں بول سکتی۔"،ایمان کو محسوس ہوا تھا کہ وہ ان دونوں سے نہیں کہہ رہے۔وہ اپنی ہی دھن میں خود سے ہی یہ سب کہتے جا رہے تھے۔اس نے چہرہ پھیر کر یکدم ہی

ثمرین کو دیکھا تھا۔اوراب کی باروہ صحیح معنوں میں حیران ہوئی تھی۔

ثمرین کے دونوں رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔آنکھیں بھی متورم وگلابی ہورہی تھیں۔گود میں دھرے ہاتھ ہولے ہولے سے کپکپارہے تھے۔اس کی کیفیت عجیب سی ہورہی تھی۔ایمان نے یکدم ہی آگے بڑھ کراس کے شانے پرہاتھ رکھاتواس نے متورم آنکھیں اس کی جانب پھیریں۔

"کیاہوا، ثمرین؟"،اس نے حیرت سے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔ثمرین نے ایک نم گہرا سانس خارج کرکے اپنی شال سے اپناچہرہ رگڑا تھا۔

"بعد میں بتاؤں گی۔"،آہستہ سے بول کروہ کھڑکی کی جانب مڑگئی تھی۔گاڑی میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خاموشی مزید جان لیواہوتی محسوس ہورہی تھی۔وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر ہواکیاہے۔باہر رات قطرہ قطرہ بہتی چلی جارہی تھی۔تاریکی بڑھتی جارہی تھی۔

☆☆☆

"تمہاری برتھ ڈے ہے پرسوں؟"، اچانک ہی ثمرین نے اسے چہرہ اٹھا کر دیکھ کر پوچھا تو اس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہوں۔"

وہ دونوں اس وقت نشستوں میں سے دوپر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام کاغذات وغیرہ سب دکھا دیئے تھے۔ تمام کام ہو چکے تھے، محض تصاویر کھنچوانا رہتی تھی۔ ثمرین کے ہاتھ میں ایمان کے بھی کاغذات تھے جن کا وہ یونہی بے مقصد مطالعہ کر رہی تھی، جبھی مطالعہ کرتے کرتے یکدم ہی ٹھہری تھی۔

"پھر تو ہمیں سیلیبریٹ کرنی چاہئے، نہیں؟"، اب کے اس نے ہلکا سا مسکرا کر پوچھا تو ایمان کچھ ٹھہر سی گئی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار کب اس کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کی گئی تھی اور اس کو یاد آیا کہ ایسا تو کچھ سال پہلے ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب ہر سال ٹیوشن میں اس کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔ کاکا، روحان، رضا اور میرو بھی اس سیلیبریشن میں آگے آگے رہتے تھے۔ وہ دن کتنے اچھے تھے ناں! وہ لوگ بھی تو اتنے ہی اچھے تھے!

اس نے ایک گہرا سانس لے کر سر ہولے سے نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں۔ سیلیبریشن کی ضرورت نہیں ہے۔"، اس کے دھیمی آواز میں کہنے پر ثمرین نے منہ پھولا کر اسے دیکھا تھا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں ہے ضرورت؟"، ایمان نے ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ وہ ایک بار پھر بول پڑی تھی۔ "تمہیں معلوم ہے؟ رمیس صاحب ہر بار میری سالگرہ منایا کرتے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے غزل بی بی اور ارحم بابا کی منایا کرتے تھے۔۔۔"، وہ بول کر ایک لمحے کو ٹھہری تھی۔ آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی امڈ آئی تھی۔ "وہ ناں، میرا بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے۔۔۔ مجھے بالکل اپنے بیٹے کی ہی طرح ٹریٹ کرتے تھے۔ مجھے ڈانٹتے بھی حق سمجھ کر تھے اور سمجھاتے بھی فرض سمجھ کر تھے۔ انہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا تو نہیں سکھایا تھا، مگر سر اٹھا کر چلنا انہوں نے ہی سکھایا تھا۔۔۔"، بولتے ہوئے اس نے چہرہ موڑ کر ایمان کو دیکھا تھا۔ ایمان کو اس کی آنکھوں میں بہت تکلیف نظر آئی تھی۔ بے انتہا اذیت اور درد بھی۔۔۔

www.novelsclubb.com

"تم جانتی ہو؟ان کے انتقال پر مجھے یوں لگا تھا کہ گویا میں نے اپنا باپ ایک بار پھر کھو دیا۔وہی اذیت ایک بار پھر سے ہوئی تھی۔وہی تکلیف ایک بار پھر سے ہوئی تھی۔حالانکہ انہوں نے مجھ سے ہمیشہ ایک فاصلہ بنائے رکھا تھا،وہی فاصلہ جو اللہ نے مرد اور عورت کے بیچ مقرر کر رکھا ہے۔۔۔پھر بھی وہ میرے دل کے بے حد قریب تھے،ایمان۔مجھے بولنا انہوں نے نہیں سکھایا،مگر حق کے لیے بولنا اب انہوں نے ہی مجھے سکھایا ہے۔میں پہلے دن سے ہی غزل باجی کے فیصلے میں ان کے ساتھ تھی۔۔۔وہ تو ارشد صاحب کے حکم کے مطابق ان کو سمجھاتی تھی، ورنہ خود میں تو یہی چاہتی تھی کہ وہ رمیص صاحب کا کیس لڑیں۔۔۔اور جیتیں بھی۔"

ایمان کے منہ سے بے ساختہ ہی "انشاءاللہ" نکلا تھا۔ثمرین اب بھی کہتی جارہی تھی۔ایمان اب بھی سنتی جارہی تھی۔آنکھیں اس کی بھی نم تھیں۔دل اس کا بھی دکھی تھا۔

"وہ میرے پیچھے ہوتے تھے تو لگتا تھا کہ سر پر باپ کا سایہ سلامت ہے۔کاندھے کسی مضبوط سہارے پر ہیں۔وہ نہیں ہیں تو لگتا ہے کہ ثمرین ایک بار پھر یتیم ہو گئی ہے۔۔۔"،آنسو قطاروں کی سی صورت رخساروں پر بہتے جارہے تھے۔آنکھیں دہکنے لگی تھیں۔"جانتی ہو،

ایمان؟ مجھے اب بھی ان کے وہ زخمی ہاتھ یاد ہیں۔اب بھی ان کا وہ مردہ وجود یاد ہے۔۔۔ مگر جانتی ہو کیا؟"، ایمان نے نم پڑتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔"ان کا مردہ وجود بھی مردہ نہیں لگتا تھا، ایمان۔ان کا جسم مردوں کی مانند ٹھنڈا نہیں تھا۔ان کا جسم تین دن بعد بھی نہایت گرم تھا۔ جیسے خون کی گردش ابھی بھی جاری ہو۔ان کی موت کے دوسرے دن غزل باجی نے انہیں دیکھا تھا۔ مجھ میں ہمّت نہیں تھی۔۔۔ میں نے جنازے کے وقت دیکھا تھا۔۔اور غزل باجی بتاتی ہیں کہ۔۔۔"، یہاں اسے سانس لینے میں ایک عجیب سی دشواری ہوئی تھی۔اگلی بات رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ایمان کو بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔"دوسرے دن کے مقابلے ان کے جنازے والے دن ان کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ہاتھ کھردرے تو تھے مگر گرم ہی تھے۔ان کے باقی ماندہ ناخن بھی بڑھے ہوئے تھے۔۔۔"، وہ کہتی جا رہی تھی اور ایمان سن پڑتے دماغ اور کانوں کے ساتھ سنتی جا رہی تھی۔ جسم ہلنے سے انکاری ہو گیا تھا۔آنکھیں جھپکنے کو تیار نہ تھیں۔"تم جانتی ہو ایمان، اس کا مطلب کیا ہوا؟"

اور ایمان نے بے ساختہ ہی سر نفی میں ہلایا تھا۔سانس روک رکھا تھا اور کان ثمرین کے اگلے

الفاظ سننے کے منتظر تھے۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شہید ہوئے تھے۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ تھے۔ زندہ انسان میں ہی تو گرمائش ہوتی ہے ناں؟ مردہ تو یخ ٹھنڈا ہوتا ہے۔"، اور آنسو اس کی آنکھوں سے ایک تواتر کے ساتھ بہہ چلے تھے۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ جانتی تھی کہ یہ الفاظ صرف رمیص کے مردہ وجود پر صادق نہیں اترتے تھے۔ یہ انسان کے دل پر بھی صادق اترتے تھے۔ جب تک انسان کے دل میں احساسات کی گرمائش محسوس ہوتی رہے، وہ مردہ نہیں ہو سکتا۔ جب احساسات ختم ہوتے محسوس ہوں تو انسان کا دل بھی مردہ، یخ اور ٹھنڈا پڑتا محسوس ہوتا ہے۔ ایمان سن و شل، ساکت سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ کیا ایسا بھی ممکن تھا؟ کیا مردہ انسان کے جسم میں گرمائش ہونا ممکن ہے؟ ایسے کیسے ہو سکتا تھا؟

کچھ لمحات مزید خاموشی سے سرک گئے۔ لمحے بیتتے ہوئے ان دونوں مجسموں پر ایک خاموش نظر ڈالتے گزرتے جارہے تھے۔ جبھی ان میں سے ایک مجسمہ دوسرے کی جانب مڑا تھا۔ سر اٹھا کر دوسرے مجسمے کو دیکھا گیا تھا۔

www.novelsclubb.com

"تم گاڑی میں رو کیوں رہی تھی، ثمرین؟"، اس کے پوچھنے پر ثمرین نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حزن ٹھہرا تھا۔ چند پل اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نظریں پھیر کر دور کھڑی گاڑی میں سر جھکائے بیٹھے بہادر بھائی کو دیکھا تھا۔ نینوں کا حزن بڑھا تھا۔ نمی مزید گھلی تھی۔

"بہادر بھائی کا ایک بیٹا تھا، قیوم۔"، اب کے اس نے بولنا شروع کیا تو ایمان حیرت سے اسے سنے گئی۔ "بہادر بھائی کی بیوی، ریحانہ باجی کا انتقال ان کی جوانی میں ہی ہو گیا تھا۔۔۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی، جب قیوم محض چار پانچ سال کا تھا۔"، آنکھوں کی نمی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ، ہر ادا ہوتے لفظ کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ باہر رات مزید گہری ہو رہی تھی۔

"بہادر بھائی کی واحد امید، ان کا واحد آسرا قیوم تھا۔ انہوں نے اسے بہت اچھا پڑھایا تھا۔ وہ قابل اور ہونہار بھی بہت تھا۔ ٹاپر اسٹوڈنٹ۔ بہادر بھائی کا فخر۔ وہ مجھ سے پانچ سال بڑا تھا۔ ایک روز وہ یونیورسٹی سے واپس آ رہا تھا۔۔۔ اور اسے ایک ڈمپر نے ہٹ کر دیا تھا۔ اور اس حادثے نے اس کی جان لے لی۔۔۔ وہ تو چلا گیا مگر بہادر بھائی زندگی اور موت کی درمیانی

صورتحال میں پھنسے یہیں رہ گئے۔ان کی زندگی کا کل اثاثہ ان کی اولاد تھی۔اور وہ اولاد ان سے لے لی گئی۔وہ آج بھی کبھی کسی کا ایکسیڈنٹ دیکھتے ہیں تو کئی دنوں تک تکلیف اور اذیت کا شکار رہتے ہیں۔ان کا زخم کبھی بھرا تو تھا ہی نہیں، مگر خون ہر بار پھر سے رسنے لگتا ہے۔"،وہ بول کر خاموش ہوئی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔نمی آنکھوں سے کب کی آزاد ہوئی بہتی جا رہی تھی۔اس نمی کو پونچھنے کی اس نے زحمت نہیں کی تھی۔ایمان کی نم آنکھیں بہادر بھائی پر جمی تھیں۔وہ کتنے سالوں سے اذیت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔کبھی کبھار تو ایمان دوسروں کی تکالیف دیکھتی تو اسے اپنی تکلیفیں بہت چھوٹی لگنے لگتیں۔ریت کے کسی ذرّے سے بھی چھوٹی!

☆☆☆

وہ گھر پہنچے تو فجر کی اذانیں ہر سو گونج رہی تھیں۔تھکن سے چور ہوئے وہ تینوں ہی اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے تھے۔پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی تو کمرے کی کھڑکی پر لگے پردوں سے فجر کی گہری نیلی و جامنی سی روشنی، ہلکی ہلکی جھلکتی

ہوئی کمرے میں آتی، کمرے کو نیم روشن سا کر رہی تھی۔اس نے تھکاوٹ کے عالم میں پرس صوفے پر پھینکا تھااور واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔کچھ دیر بعد وہ واش روم سے نکلی تو ٹھوڑی سے پانی کی بوندیں ٹپکتی جارہی تھیں۔چہرہ دھلا دھلایا،تازہ دم سا لگتا تھا۔گیلا چہرہ تولیے سے سوکھائے بغیر ہی وہ چلتی ہوئی میز تک گئی تھی اور وہاں سے جائے نماز اٹھا کر زمین پر، عین کھڑکی کے سامنے بچھائی تھی۔پھر آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے جدا کیے تو گہرے جامنی رنگ کا وسیع و عریض آسمان نگاہوں کے سامنے آیا۔فجر کے بعد کا آسمان اس کا پسندیدہ تھا۔نجانے کیوں مگر ایک انجانا سا سکون اپنی روح میں اترتا محسوس ہوتا تھا اس پہر۔

یونہی آسمان کو تکتے تکتے اس نے دوپٹہ چہرے کے گرد باندھا تھا پھر نیّت باندھے جائے نماز پر کھڑی ہوگئی تھی۔لمحات دھیرے دھیرے سرکتے جارہے تھے۔سرکتے سرکتے اس کو ایک نرم نظر دیکھتے جارہے تھے۔نماز مکمل کر کے وہ آرام سے بیٹھی تھی،پھر ہاتھ دعا کے سے انداز میں اٹھا کر اس نے چہرہ اٹھا کر نگاہیں وسیع و عریض آسمان پر ٹکائی تھیں۔

کتنا وسیع تھا ناں یہ آسمان! ہر سو پھیلا ہوا! نجانے کتنے ہی رنگ خود کے اندر سموئے ہوئے۔۔۔

اور اس کے کتنا اوپر اس وقت اس کا رب موجود تھا۔اسے ہی دیکھ رہا تھا۔اسے ہی سن رہا تھا۔کیسے اتنا دور ہو کر بھی اتنا قریب تھا اس کا رب! اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ! اس کی سانسوں سے بھی زیادہ!

فجر دھیرے دھیرے بیتتی جا رہی تھی۔ لمحات گزرتے جا رہے تھے۔۔۔اور وہ۔۔۔وہ بغیر لب ہلائے، بغیر کچھ کہے وہیں بیٹھی آسمان کو تکتی جا رہی تھی۔۔۔ مگر کچھ الفاظ اور کچھ دعائیں ایسی ہوتی ہیں جو لبوں سے آزاد نہ ہو کر بھی چٹانوں سے بھی بڑھ کر طاقت رکھتی ہیں۔جو خاموش ہوتی ہیں مگر ان کی آواز آسمانوں کو چیرتی ہوئی بارگاہ الٰہی میں جا پہنچتی ہے۔

اس کا دل بھی ایسے ہی الفاظ ادا کر رہا تھا۔اس کا دل بھی ایسی ہی دعائیں مانگ رہا تھا!

☆☆☆

حیدر آباد کے وسیع آسمان پر اس وقت خوب گھرے سرمئی سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈ حد درجہ بڑھی ہوئی تھی۔ بارش کی پیشن گوئی بھی کی گئی تھی خبروں میں۔ایسے میں زاویار احمد

صاحب کے گھر میں جھانکا جاتا تو کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی سنائی دیتیں۔ کچن میں اگلے سلیب پر رضیہ بیگم سر جھکائے سبزیاں کاٹنے میں مصروف تھیں۔ کٹنگ بورڈ پر چھری لگتی تو خاموش پڑے گھر میں کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوتی۔ گھر میں ہر سو ایک چھاؤں سی چھائی تھی۔ باہر بھی روشنی گھٹ کر نیم اندھیرے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ مگر لگتا یوں تھا کہ مغرب بیتے کچھ ساعتیں ہی گزری ہوں۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے کام میں منہمک تھیں جبکہ ان کے پیچھے ان سے کچھ ہی فاصلے پر فاطمہ پشت کیے کھڑی تھی۔ اس کے عین سامنے چولہے پر سالن کا دیگچا تھا جس میں وہ چمچ ہلاتی جا رہی تھی۔ سادہ سے کپڑے پہنے، بال ایک چٹیا میں گوندھے، وہ سادہ سی، مصروف سی دکھتی تھی۔

گھر میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ شانزے ایمن کو لے کر اپنی ماں کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ زاویار صاحب اپنی جاب پر تھے جبکہ زرار فی الوقت باہر گیا ہوا تھا۔ آج اس کی آفس سے چھٹی تھی یا نجانے اس نے خود چھٹی کی تھی، مگر وہ آج صبح سے گھر پر ہی تھا۔ ایسے میں چمچ دیگچے میں ایک جانب کو ٹکا کر فاطمہ دھیرے سے مڑی تھی۔ چند پل مصروف سی رضیہ کو خاموش

نظروں سے تکا تھا۔۔۔ پھر ایک گہری سانس لیتی وہ ان کی جانب چلی آئی تھی۔

"امی۔"، اس نے انہیں پکارا تو انہوں نے مصروف سے انداز میں محض "ہوں" کہنے پر اکتفا کیا۔ اس کے گلے میں گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے انہیں شانوں سے تھاما تھا۔ رضیہ کے کام کرتے ہاتھ یکدم ہی رکے تھے۔ سوالیہ نگاہیں اٹھا کر انہوں نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر درج تاثرات دیکھ کر انہیں ایک الجھن سی ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا ہے، فاطمہ؟"، ان کے پوچھنے پر فاطمہ نے چہرہ جھکا کر اپنے پیروں کو دیکھا تھا۔ اس کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی بولنے کی۔

"فاطمہ۔ کچھ پوچھ رہی ہوں میں۔"، انہوں نے اب کی بار اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کچھ جتا کر کہا تو اس نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ انہیں اس کی آنکھوں میں نمی نظر آئی تھی۔ یکدم ہی ایک سرخ بتّی جلتی بجھتی نظر آئی تھی انہیں۔ یقیناً کچھ تو تھا جو غلط تھا!

"کیا ہوا ہے؟"، اب کے انہوں نے پوچھا تو فاطمہ نے بہت ہمّت کر کے انہیں دیکھا۔ وہ نہیں

www.novelsclubb.com

جانتی تھی کہ ان کاری ایکشن کیا ہونے والا ہے، مگر وہ خوفزدہ تھی۔ بہت زیادہ!

"امی۔۔۔ ایمان کراچی میں ہے۔۔۔ (رضیہ بیگم کے چہرے پر نا سمجھی ابھری تھی) مگر۔۔۔ (اور یہاں ان کی آنکھیں پھیلی تھیں) مگر وہ ہمارے گھر میں نہیں ہے۔"، بولتے ہوئے اس نے ایک نظر گھر کے مین گیٹ کی جانب اٹھائی تھی۔ اسے زرار کے آنے سے پہلے پہلے پوری بات ان کے گوش گزار کرنی تھی۔ رضیہ بیگم ساکت تھیں۔ ایسے جیسے کوئی ابھی ان کو چھوئے اور وہ ریت کے مجسمے کی مانند ڈھے جائیں۔

"زرار بھائی نے کراچی والا گھر بیچ دیا ہے، امی۔ ایمان کو اس دن بہت مصیبت اٹھانا پڑی تھی۔ اس کے پاس وہاں رہنے کو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ پورا دن سڑکوں پر رل رہی تھی۔ ماری ماری پھر رہی تھی۔۔۔ اس کے ساتھ حادثہ بھی پیش آیا تھا (البتہ حادثے کی نوعیت بتانے کی ہمّت نہ پاتی تھی وہ خود میں)۔۔۔ اتنی مشکلوں سے اسے وہاں رہنے کو ایک سیف مقام ملا تھا۔۔۔"، ابھی وہ مزید کہتی ہی کہ رضیہ بیگم نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ وہ گھر میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟ کس کے پاس ہے؟"، ان کے لہجے

میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ وہ گویا کسی بھی پل ڈھے جانے والی تھیں۔ فاطمہ نے ایک نم سانس خارج کیا تھا۔

"ایک عورت ہیں کوئی۔۔۔ غزل رمیص نام ہے ان کا۔ ان کے پاس پیئنگ گیسٹ کے طور پر رہ رہی ہے وہ۔"، وہ خاموش ہوئی تو رضیہ بیگم کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکتا رخسار پر بہہ گیا۔ کیا اپنی ہی اولاد بھی دھوکا دیا کرتی ہے؟ کیا کوئی اپنی ہی اولاد سے دھوکے کی امید رکھ سکتا ہے؟ حیوانوں کی اس دنیا میں، ہاں!

"تم۔۔۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ وہ دو مہینے سے کہیں اور، کسی اور کے پاس رہ رہی ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟ آہ میرے اللہ! میرے اللہ۔۔۔ کیا کروں میں؟"، وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے نم آواز میں کہتی جا رہی تھیں۔ ان کے جھریوں زدہ ہاتھ ہولے ہولے سے کپکپا رہے تھے۔ فاطمہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی کے سے انداز میں تھاما تھا۔

"آپ فکر نہ کریں، امی۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے، الحمدللہ۔ خیریت سے ہے۔ محفوظ مقام پر ہے۔"، اس نے کہا تو انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں تکلیف

کے تاثرات تھے۔ چہرے پر الگ اذیت رقم تھی۔ فاطمہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"کیا اپنی اولاد سے بھی دھوکے کی توقع رکھ سکتا ہے انسان؟"، وہ جیسے بہت بے بسی سے پوچھ رہی تھیں۔ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس اولاد پر اتنا اعتبار کر کے انہوں نے اپنا گھر اس کے نام کیا تھا، وہی اولاد انہیں دھوکا دے چکی تھی۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک چکی تھی۔

"امی، میں نے ایک گھر لیا ہے نیا۔"، زرار کی چند ماہ پہلے کہی گئی بات جو انہوں نے مذاق میں اڑا دی تھی، اب ان کی سماعت میں گونجتی، اسے زہر آلود کر رہی تھی۔ کیا دوسروں کے خوابوں کے ملبے پر اپنے خواب تعمیر کرنے والے لوگ انسان ہوا کرتے ہیں؟ کیا انہیں انسان کہنا انسانیت کی تذلیل و تضحیک نہیں؟

☆☆☆

سرمئی بادل اب ہلکی ہلکی بوندیں برسانے لگے تھے۔ وہ جونہی گھر میں داخل ہوا، اسے دور سے ہی کچن خالی نظر آیا۔ اسے شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ ایسے میں وہ یہی سوچ رہا تھا کہ گھر جاتے

ساتھ ہی کھانا کھائے گا۔ مگر اب امی موجود ہی نہیں تھیں کچن میں تو کس سے کھانا مانگتا؟ خیر، وہ سر جھٹکتا، اپنے پیچھے دروازہ لاک کرتا اندر بڑھ آیا تھا۔

دن کا ایک بج گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ گہرا اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ وہ چلتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے موجود کمرے کا دروازہ کھول کر رضیہ بیگم باہر نکلی تھیں۔

"امی وہ۔۔۔"، ابھی وہ اپنی ہی دھن میں کچھ کہتا کہ ان کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں دیکھ کر ٹھہر سا گیا۔ ان کا چہرہ اسے بہت کچھ غلط ہونے کا عندیہ دے رہا تھا۔ رضیہ بیگم نگاہیں اسی پر ٹکائے چلتی ہوئی ایک ہی جست میں اس تک پہنچی تھیں اور جھپٹ کر اسے گریبان سے تھاما تھا۔ وہ ہکّا بکّا سا کھڑا رہ گیا تھا۔

"بے شرم انسان۔۔۔ شرم نہ آئی تجھے؟"، وہ متورم آواز میں زور سے دھاڑیں تو فاطمہ بھی فوراً سے اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ پریشانی سے رک سی گئی تھی۔ زرار پریشانی سے ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"اپنی ماں کو دھوکا دیتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی روح نہ کانپی تیری؟ ایک پل کے لیے بھی خوف نہ آیا؟"، وہ کہتے کہتے ایک بار پھر سے رونے لگی تھیں۔ ان کی آواز بہت بلند تھی، اتنی کہ صحن کے ہر کونے تک باآسانی پہنچ رہی تھی۔

"تو جانتا تھا ناں کہ میں نے وہ گھر ایمان اور فاطمہ کے لیے رکھا ہے۔۔۔ پھر بھی تو نے اسے بیچ ڈالا، کم ظرف۔"، بولتے بولتے ایک ہاتھ سے اس کا گریبان تھامے، دوسرے ہاتھ سے انہوں نے یکدم ہی اس کے چہرے پر زوردار طمانچہ رسید کیا تھا۔ وہ ساکت و شل سا کھڑا رہ گیا تھا۔ کان دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ چہرہ بھی سرخ پڑ رہا تھا۔ اس کی چوری یوں پکڑی جائے گی، اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

www.novelsclubb.com

"ارے کچھ تو مان رکھ لیتا میرے اعتماد کا۔ تھوڑا تو بھروسہ قائم رکھ لیتا میرا۔"، وہ بلند آواز میں چیختی روتی، اسے ملامت کیے جا رہی تھیں۔ گریبان اب تک تھام رکھا تھا۔ زرار نے چہرہ جھکا لیا تھا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ انہیں کیسے پتا چلا، مگر فی الوقت یہی ناقابلِ یقین تھا کہ انہیں علم ہو چکا ہے۔

"کم ظرف انسان۔ تیری وجہ سے تیری بہن خوار ہوئی، رسوا ہوئی، بے گھر ہوئی۔۔۔ مگر تو۔۔۔"، کہتے ہوئے اس کا گریبان چھوڑ کر انہوں نے اسے پیچھے کی اور دھکا دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہوا تھا۔ مگر اب کی بار اس نے چہرہ اٹھا رکھا تھا۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ خود کو سنبھال کر وہ یکدم ہی بے یقینی کے عالم میں بڑبڑایا تھا۔

"ایمان کراچی میں ہے؟"، اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں ہاں کراچی میں ہے۔۔۔ میں نے تو اسے یہ سوچ کر وہاں بھیجا تھا کہ آرام سے اپنے گھر میں رہ لے گی اور جب حالات بہتر ہو جائیں گے، تو میں اسے واپس بلوالوں گی۔۔۔ مگر تو۔۔۔ تو نے تو اسے بے گھر ہی کر دیا، زرار۔"، وہ بولتے بولتے بے بسی کے عالم میں اپنا سر پکڑے وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھیں۔ ایسی اولاد ہونے پر ماتم واجب تھا ان پر۔

زرار نے چہرہ موڑ کر فاطمہ کو دیکھا تھا۔ وہ بھی متورم سرخ آنکھیں لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو ذرا بھی شرم نہیں آئی، بھائی؟ ہمارا حق کھاتے ہوئے آپ ذرا بھی نہیں کانپے؟ دل نے ذرا سی بھی ملامت نہیں کی؟"، وہ افسردگی اور افسوس سے کہتی جا رہی تھی اور وہ لب بھینچے سنتا

جار ہا تھا۔ہاتھوں کی مٹھیاں بھی بھینچ رکھی تھیں۔"میں اور ایمان کوئی سوتیلے تو نہیں ہیں۔۔۔ آہ بھائی آہ! کاش ہمارے ایک ہی بھائی ہوتے۔۔۔کاش صرف آدم بھائی ہی ہمارے بھائی ہوتے۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔"، وہ یکدم ہی اشتعال کے عالم میں زور سے دھاڑا تھا۔جبڑا بری طرح بھینچ رکھا تھا، یوں کہ گردن کی رگیں تک ابھری ہوئی تھیں۔سپید رنگت غصّے کی شدّت سے سرخ پڑ رہی تھی۔

"ہاں بیچا ہے میں نے وہ گھر۔۔۔صرف تمہارا اور ایمان کا حق نہیں تھا اس پر۔میرا اور میری بیٹی کا بھی حق تھا اس پر۔میں نے صرف اپنا حق لیا ہے۔۔۔اور کس آدم بھائی کی بات کر رہی ہو تم؟ وہی جو اپنے ماں باپ کو بڑھاپے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ بے یارو بے آسرا؟ خالی ہاتھ؟ اور کس ایمان کی بات کر رہی ہو تم؟ جو خاندان کے چہرے پر کالک مل کر چلی گئی ہے؟ جس نے اتنا بھی نہ سوچا کہ اس کا باپ اور بھائی معاشرے میں کبھی سر اٹھا کر نہیں چل پائیں گے اس کی اس حرکت کے بعد؟"، وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔اس کی غراہٹ بھری آواز گھر کے در و دیوار کو

کپکپا دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ ہر شے دم سادھے اسے سن رہی تھی۔

"بکواس تم بند کرو اپنی۔"، اب کی بار چیخنے والی رضیہ تھیں۔ ان کی آواز میں وہ اشتعال تھا کہ الامان۔ چہرہ ان کا بھی سرخ پڑ رہا تھا۔ آنکھیں ان کی بھی دہک رہی تھیں۔ آنسو اب سوکھ چکے تھے۔ مٹھیاں بھینچ چکی تھیں۔ فرش پر ہاتھ سے زور دیتیں وہ کھڑی ہوتیں ایک بار پھر اس کے روبرو آئی تھیں۔

"آدم میرا بیٹا ہے، تھا اور رہے گا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ اس کو میں نے بھیجا تھا یہاں سے۔ بالکل ویسے جیسے ایمان کو بھیجا تھا۔ تمہارے باپ کی زیادتی سے بچانے کے لیے۔۔۔ وہ راضی نہیں تھا یوں جانے پر۔ اسے بھی میں نے بھیجا تھا۔۔۔ بہت کمزور سمجھ لیا ہے تم سب نے مجھے۔۔۔ بہت ہو گیا اب۔ بہت زیادہ ہو گیا۔ اب تک رابطے میں ہے وہ میرے ساتھ۔ مجھے میرا اور میری بیٹیوں کا خرچہ بھی بھیجتا ہے۔ اپنے باپ کی خیریت بھی پوچھتا رہتا ہے۔۔۔ تمہاری طرح نہیں۔ تم تو ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی کبھی مجھ سے یہ نہیں پوچھتے کہ امی، آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں آپ کو؟"، بولتے بولتے ان کا سانس پھول گیا

تھا۔ چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ زرار دھواں ہوتے وجود کے ساتھ ان کے انکشافات سن رہا تھا۔ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کیا کہتا وہ؟ کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ وہ اب بھی کہہ ہی رہی تھیں۔

"اور جہاں تک بات ہے ایمان کے یہاں سے جانے کی، تو ایسے باپ اور ایسے بھائی کے ساتھ یہی ہونا چاہئے۔ تم بھائی کہلانے کے لائق نہیں ہو۔ تمہارا باپ، باپ کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ بھائی تو آدم جیسے ہوتے ہیں۔ تمہارے جیسے نہیں۔ تمہارے منہ پہ کالک ایمان نے نہیں، تمہارے کرتوتوں نے ملی ہے۔ تمہارے باپ کے منہ پہ کالک ایمان نے نہیں، ان کی انا اور خود غرضی نے ملی ہے۔ ان کے تکبر نے ملی ہے۔ جیسے کو تیسا ہی ملتا ہے ناں۔ تمہیں بھی وہی ملا ہے۔"، وہ بول کر خاموش ہوئیں تو سارے میں جیسے سناٹا سا چھا گیا۔ ہر شے ساکت سی ہو چکی تھی۔ زرار کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو چکا تھا۔ رضیہ اب گہرے گہرے سانس لیتی خود کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ زرار اب تک شل سا کھڑا تھا۔ فاطمہ میں بھی ہلنے جلنے کی سکت نہ تھی۔ باہر برستی بوندا باندی نے رفتار پکڑ لی تھی۔

کوئی گھر کے مین گیٹ کے آگے ساکت کھڑا بھیگتا جا رہا تھا۔ ہلنے کی سکت اس میں بھی باقی نہ

www.novelsclubb.com

تھی۔ قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ان کی سیاہ آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر ساکت ہو کر ٹھہری رہ گئی تھیں۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"اب تم اپنا سامان سمیٹو یہاں سے اور میرے گھر سے دفع ہو جاؤ۔ جاؤ اپنے اس گھر میں جس پر تمہارا اور تمہاری بیٹی کا حق ہے۔۔۔ کیونکہ اب اس گھر میں تو تمہارا کوئی حق باقی نہیں رہا۔"، اب کے رضیہ نے خوب ضبط کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے ساکت وجود میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ خوب بے یقینی سے اس نے انہیں دیکھا تھا۔

"آپ۔۔۔ آپ مجھے گھر سے نکال رہی ہیں، امی؟ مجھے ؟"، وہ جتنا بے یقین ہوتا اتنا کم تھا۔ رضیہ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ان کی آنکھوں میں بھی حزن کی نمی ٹھہری تھی۔

"جب تم مجھے اپنے دل سے نکال سکتے ہو تو میں تمہیں گھر سے کیوں نہیں نکال سکتی، ہاں ؟"، اور یہاں اسے چپ سی لگ گئی تھی۔ فاطمہ کی آنکھوں سے بھی ایک کے بعد ایک آنسو ٹپکتے جا رہے تھے۔

"بلکہ یوں کرو کہ تم یہیں ٹھہرے رہو۔ میں اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے جا رہی ہوں۔ تم اور

تمہارا بے حس باپ یونہی رہتے رہو یہاں۔ یہاں ہم احساس والوں کی کوئی جگہ نہیں۔"، وہ بول کر فاطمہ کی جانب مڑی تھیں۔اس نے بھی متورم گلابی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔ باہر بجلی بہت زور کی کڑکی تھی۔ زاویار احمد صاحب کو یہ بجلی اپنے سر پر گرتی محسوس ہوئی تھی۔

"اپنا سامان باندھو، فاطمہ۔ اب یہاں مزید نہیں رکنا۔"، وہ بول کر ایک جھٹکے سے اپنے کمرے کی جانب مڑنے لگی تھیں جب ان کی نگاہ مین گیٹ کے قریب ایستادہ زاویار صاحب پر گئی تھی۔ وہ ایک پل کو رکی تھیں اور پھر اگلے ہی پل سر جھٹکتی اندر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ زاویار صاحب مرے مرے قدموں کے ساتھ بڑھتے ہوئے اندر آئے تھے۔ زرار ساکت سا کھڑا تھا۔ بالکل پتھر کے کسی بت کی طرح۔

www.novelsclubb.com

فاطمہ بھی بغیر کسی کو دیکھے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ زاویار احمد صاحب کے پیروں میں یکدم ہی ایک برق رفتاری سی آئی تھی۔ وہ ایک بھی پل ضائع کیے بغیر رضیہ بیگم کے پیچھے اندر کی جانب بڑھے تھے۔ وہ الماری کے سامنے کھڑی اندر سے اپنے کپڑے نکال نکال کر پلنگ پر پھینک رہی تھیں۔ زاویار صاحب تیزی سے ان کی جانب بھاگے تھے۔ انہوں نے فوراً سے ان

کا بازو تھاما تھا۔

"رضیہ، میری بات سنو۔"، ایمان کے جانے کے بعد سے وہ اب ان سے مخاطب ہوئے تھے۔

رضیہ نے ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ جھڑکا تھا۔

"چھوڑیں مجھے۔"، وہ بدک کر بولی تھیں۔

"تم ایسے نہیں جاسکتی۔ میں تمہیں یوں یہاں سے جانے کی اجازت ہر گز نہیں دوں گا۔" وہ عجیب بے بسی کے عالم میں بولے تو رضیہ نے استھزائیہ انداز میں مسکرا کر سر جھٹکا۔

"آپ سے اجازت مانگ کون رہا ہے؟"، ان کا لہجہ، ان کے الفاظ، ان کی آنکھوں میں جھلکتی بغاوت۔۔۔سب زاویار صاحب کے حواس پر بہت بھاری پڑ رہی تھی۔

"رضیہ۔۔۔تم مجھے نہیں چھوڑ کر جاسکتی۔۔۔پلیز رضیہ۔۔۔ایسا مت کرو۔"، وہ ان کو ایک بار پھر شانوں سے تھام کر بے بسی کے عالم میں بولے تھے۔ان کی آنکھیں نم تھیں۔ان کے ہاتھ بھی ہولے ہولے سے کپکپا رہے تھے۔چہرہ ستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"میں آپ کو چھوڑ چکی ہوں، زاویار۔۔۔اور ظلم سہنے کی ہمّت نہیں ہے مجھ میں۔"، باہر برستی

بوچھاڑ میں تیزی آگئی تھی۔آسمان آج رو رو کر درد کو سوا کرنے کے جتن کر رہا تھا۔زاویار صاحب ان کے ہاتھ تھامے ہی بے بسی کے عالم میں زمین پر بیٹھتے چلے گئے تھے۔ان کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کر ان کے گالوں پر پھسلنے لگی تھی۔رضیہ بیگم مڑتے مڑتے یکدم ہی ساکت ہوئی تھیں۔ان کی نگاہیں ان کے بہتے آنسوؤں پر ٹھہر گئی تھیں۔ان کی شادی کو تقریبا پینتالیس چھیالیس سال ہونے کو آئے تھے اور یہ پہلی بار تھا کہ انہوں نے زاویار کو یوں روتے ہوئے دیکھا تھا۔وہ تو اپنے والد کے انتقال پر بھی چند آنسو بہا کر چپ ہو گئے تھے۔پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ یوں رو رہے تھے؟

"کیا ہو گیا ہے،زاویار؟"،ان کے دل میں ترحم نہیں آیا تھا۔نہ ہی انہیں ان پر ترس آیا تھا۔یہ تو بس ایک تجسس تھا جس نے انہیں یہ پوچھنے پر مجبور کیا تھا۔

"تم مجھے چھوڑ کر مت جاؤ،رضیہ۔تم جیسا کہو گی،ویسا ہو گا۔اگر تم کہو گی تو میں یہ گھر بھی تمہارے نام کر دوں گا۔۔۔تم کہو گی تو زرار کا حصّہ بھی ختم کر دوں گا اس گھر میں سے۔"،ابھی وہ مزید بولتے ہی کہ رضیہ نے انہیں دیکھتے ہوئے نہایت افسوس سے سر نفی میں ہلایا تھا۔ان کی

آنکھوں میں افسوس سا تھا۔

"میری اولاد میری دشمن نہیں ہے، زاویار۔ میں آپ کی طرح نہیں ہوں کہ اپنی ہی اولاد سے دشمنی کروں۔ مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔ ہاں مگر اپنی بیٹیوں اور آدم کے لیے ان کا جائز حق چاہیے۔ زرار کا جو حق بنتا تھا، اس نے خود ہی لے لیا۔ اب باقیوں کے حقوق پورے کریں گے آپ، تب ہی کچھ سوچا جا سکتا ہے۔"، وہ قطعی انداز میں اپنا فیصلہ سنا رہی تھیں۔ کھلے دروازے سے باہر کھڑا زرار اب بھی ساکت دکھتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی گفتگو بھی سن رہا تھا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔۔۔ دل میں ایک ہڑک سی بھی اٹھ رہی تھی۔۔۔ کہ اگر واقعی اس گھر میں سے حصّہ اسے نہ دیا گیا تو؟

www.novelsclubb.com

رضیہ اب مڑ کر پلنگ کی دوسری جانب گئی تھیں اور جھک کر پلنگ کے نیچے سے سوٹ کیس نکالنے لگی تھیں۔ خاموشی سے سوٹ کیس نکال کر پلنگ پر رکھا تھا۔ پھر اپنے کپڑے بغیر تہہ کیے، سوٹ کیس کے اندر ٹھونسنے لگی تھیں۔ وہ گویا یہاں ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ زاویار صاحب ایک گہری متورم سانس خارج کرتے دھیرے سے اٹھ کھڑے ہوئے

تھے۔ایک نظر رضیہ کو دیکھ کر وہ مڑے تھے اور سامنے کھڑے زرار کو دیکھا تھا۔وہ آنکھوں میں تفکر اور تشویش لیے انہیں تک رہا تھا۔

"تمہارا اس گھر میں اب کوئی حصّہ باقی نہیں ہے، زرار۔یہاں رہنا چاہو تو رہ لو۔مگر جب بھی یہ گھر بکے گا، تمہیں یہاں سے جانا ہو گا۔"، وہ قطعیت سے کہتے کمرے کے باہر آئے تھے۔رضیہ بیگم سوٹ کیس میں کپڑے ڈالتے ہوئے ایک لمحے کو رکی تھیں۔چہرہ اٹھا کر زاویار صاحب کی پشت کو دیکھا تھا۔کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی زاویار صاحب تھے جو ان سے اتنی بری طرح سے پیش آتے تھے؟جو انہیں کبھی کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے؟جن کی نظر میں ان کی ذرّے برابر بھی اہمیت نہ تھی؟ان کی آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی ابھر آئی تھی، جسے چھپانے کو انہوں نے ایک بار پھر چہرہ سوٹ کیس پر جھکا لیا تھا۔

سوٹ کیس میں چند اور ضرورت کی چیزیں ڈالنے کے بعد انہوں نے سوٹ کیس بند کیا تھا۔پھر مڑ کر دروازے کے پیچھے لگی کھونٹی تک گئی تھیں۔وہاں سے اپنا سیاہ برقعہ نکالا اور پہننے لگیں۔ اسی سمے زاویار صاحب نے مڑ کر انہیں دیکھا تھا۔ان کی آنکھوں کی نمی بڑھی تھی۔وہ تیزی سے

ان تک چلے آئے تھے۔

"تم جیسا کہتی ہو، ویسا ہی ہو رہا ہے، رضیہ۔ اب تو نہ جاؤ۔"، وہ ان کا ہاتھ تھامے گڑگڑانے کے سے انداز میں بولے تھے۔ رضیہ بیگم نے چہرہ اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"ایسے خالی خولی بولنے سے کچھ نہیں ہوتا، زاویار صاحب۔ آپ کاغذی کاروائی کر کے حقیقتاً میرا کہا پورا کریں۔ تب ہی میں یہاں اس گھر میں واپس آؤں گی۔"، بولتے ہوئے انہوں نے اپنا بڑا سا برقعہ اوڑھا تھا اور مڑ کر سوٹ کیس تھاما تھا۔ زاویار صاحب لب کترتے انہیں وہاں سے جاتا دیکھنے لگے تھے۔ وہ کمرے سے نکلیں تو وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔

اسی پل فاطمہ بھی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ ایک ہاتھ سے سوٹ کیس تھامے، دوسرے کاندھے سے اس نے ایک سفید بڑا سا بیگ لٹکا رکھا تھا۔ سیاہ عبایہ اور نقاب پہنے، وہ بھی بالکل تیار سی لگتی تھی۔ زاویار صاحب نے نم نگاہیں اس کی جانب پھیری تھیں۔ ان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ مگر آج فاطمہ کے جانے سے زیادہ دکھ انہیں رضیہ کے جانے کا ہو رہا تھا۔

"تم کہاں جاؤ گی؟"، انہوں نے باہر نکلتی رضیہ سے پوچھا تو وہ ایک پل کو ٹھہریں۔ پھر مڑ کر

انہیں دیکھا۔

"فاطمہ، کیب بک کروائی تم نے؟"، انہوں نے فاطمہ کو دیکھ کر پوچھا تو اس نے جھٹ سے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر وہ زاویار صاحب کی جانب مڑیں۔

"میرے رب کی زمین بہت وسیع ہے۔ کہیں بھی چلی جاؤں گی۔۔۔اور آپ جتنی جلدی ہو سکیں، کاغذات تیار کروائیں گھر کے۔"، اور پھر انہوں نے ساکت کھڑے زرار کی جانب چہرہ موڑا تھا۔

"اپنی ماں کو چھوڑ کر تم نے وہ گھر چنا ہے، زرار۔ میری دعا ہے کہ جو تربیت میں تمہاری نہ کر سکی، وہ وہ گھر ہی کر لے کم از کم۔"، بول کر وہ افسوس سے سر ہلاتیں ایک جانب پڑے چھاتوں کی طرف گئیں۔ ایک چھاتہ پکڑ کر کھولا اور دوسرا فاطمہ کی جانب بڑھایا جسے اس نے سرعت سے تھام لیا۔ باہر بارش اب بھی تیزی سے برستی جا رہی تھی۔ گویا ہر شے کو بھیگا دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہو۔ ان کے آگے بڑھتے ہی زرار نے بھی مڑ کر ان دونوں کو دیکھا تھا جو خاموشی سے سر جھکائے مین گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

www.novelsclubb.com

پیچھے زاویار احمد صاحب کے گھر میں گہرا سناٹا سا چھا گیا تھا، ایسے جیسے یہاں سے کبھی کسی زی روح کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔

☆☆☆

ایئرپورٹ کی ٹرمنل بلڈنگ کے باہر اس وقت کچھ لوگ کھڑے تھے۔ بیریئرز کے اس پار رانیہ اور اس کی امی کھڑی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی حسنہ کی والدہ بھی موجود تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک خفگی سی تھی۔ چہرے پر سنجیدگی کا راج تھا۔ بیریئر کے اگلی جانب حسنہ وہیل چیئر تھامے کھڑی تھی۔ باہر بارش کافی ہلکی تھی۔ مون سون کے بعد نجانے کہاں سے یہ بارشوں کا اسپیل شروع ہو گیا تھا۔ کراچی، حیدرآباد سمیت سندھ کے بہت سے شہروں کو بارش نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

وہیل چیئر پر بیٹھے تازہ دم سے روحان کے چہرے پر ایک انجانی سی امید دکھتی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی والدہ کی ہدایات سن رہا تھا۔

"دیکھو۔۔۔حسنہ کے ساتھ ساتھ ہی رہنا۔کچھ بھی ضرورت ہو،خود چلنے کی بالکل کوشش نہ کرنا۔نماز اور قرآن پڑھتے رہنا۔"،وہ بولتے بولتے حسنہ کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

"تم بھی اس کا بہت خیال رکھنا،حسنہ۔اللہ کے بعد میں نے اسے تمہارے حوالے کیا ہے۔"،وہ بولیں تو ان کی آواز بہت نم تھی۔آنکھیں بھی کسی بھی لمحے بارش کی طرح بہنے کو تیار تھیں۔

حسنہ اور روحان کی نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی کر دی گئی تھی۔وہ دونوں آج کینیڈا جا رہے تھے۔۔۔نجانے کتنے دنوں کے لیے۔نجانے ان کی واپسی کب ہونی تھی اور کیسے ہونی تھی۔۔۔مگر وہ آج جا رہے تھے۔راہ گزرِ زندگی انہیں آج ایک نئے سفر پر لے کر جا رہی تھی۔انہیں نہیں معلوم تھا کہ زندگی نے ان کے لیے آگے کیا رکھا ہے۔۔۔مگر یہ راہی تیار تھے ہر چیز کا سامنا کرنے کے لیے۔۔۔کیونکہ یہی تو حقیقت ہے زندگی کی!

یہی تو کرنا ہوتا ہے ایک راہی کو۔تیار رہنا ہوتا ہے راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ،ہر شے کا سامنا کرنے کے لیے!وہ بھی تیار تھے!

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا اور وہ اور غزل اس وقت گھر میں بالکل اکیلی تھیں۔ ثمرین ارحم کے ساتھ اس کے ٹیوشن میں ہونے والی پارٹی میں گئی تھی۔ یوں بھی اس کا ٹیوشن کچھ گھر چھوڑ کر ہی تھا سو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بارش یہاں بھی خوب تڑاتڑ برس رہی تھی۔ ہر ایک شے بارش کی نم دھند میں لپٹی محسوس ہوتی تھی۔ گھر میں بھی ایک الگ سی چھاؤں سی ہو رہی تھی۔

اس وقت غزل اپنے کمرے میں بیٹھی فون پر کسی سے محو گفتگو تھی۔ سادہ سے گلابی رنگ کے شلوار قمیض کے ساتھ گلابی ہی دوپٹہ لے رکھا تھا۔ چہرہ بالکل سنجیدہ دکھتا تھا۔ وہ پلنگ پہ بیٹھی، بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ہوئی تھی۔

"ضوفی۔۔۔ دیکھو میری بات سنو۔۔۔ تم میری بات نہیں سمجھ رہی ہو۔۔۔ اس انسان کے ساتھ رہتے ہوئے تمہیں اور تمہاری بیٹی کو خطرہ ہے۔۔۔ وہ انسان نفسیاتی ہے، تمہیں یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی؟"، وہ بہت بے بسی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اگلی جانب ضوفشاں تھی جو شاید سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ غزل کی بات سن کر اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"ایسا نہیں ہے، غزل۔۔۔وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"،اس کی آواز کمزور تھی۔انداز بھی۔ ایسے جیسے اسے خود ہی اپنی کہی گئی بات پر بھروسہ نہ ہو۔غزل نے سر جھٹکا تھا۔

"کس کو بیوقوف بنارہی ہو،ضوفی؟"،اس کے لہجے میں افسوس سادر آیا تھا۔ضوفشاں نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کر کے سر صوفے کی پشت سے ٹکایا تھا۔نگاہیں سامنے لاؤنج کی اونچی کھڑکی کے پار نظر آتی مصروف سی سڑک پر جمی تھیں جس پر گاڑیاں اور لوگ آجا رہے تھے۔ ضوفی کو لندن کی ایک بات بہت بری لگتی تھی۔۔۔اور وہ تھی یہاں کی "مصروفیت"۔

یہاں کی مصروف زندگی۔یہاں کے مصروف لوگ۔یہاں کی مصروف سڑکیں۔یہاں کی مصروف روٹین۔

www.novelsclubb.com

"وہ مجھ سے محبت بھی تو کرتے ہیں ناں،غزل۔"،اس نے ایک کمزور سا عذر پیش کرنا چاہا تھا۔ غزل سر جھٹک کر استہزائیہ انداز میں ہنس دی تھی۔

"اگر یہ ان کی محبت ہے تو میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ان کی نفرت کا کیا عالم ہو گا۔"،وہ کمزور سا عذر ایک ہی جملے میں رد کر دیا گیا تھا۔ضوفی نے نم ڈبڈبائی آنکھوں کو موندا تھا۔سراب بھی

صوفے کی پشت سے ٹکا رکھا تھا۔

"جانتی ہو غزل؟ زندگی میں انسان کو بہت سے موقعوں پر بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بہت سی چیزوں پر کومپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ بہت سی چیزوں کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔ مضبوطی صرف چیرنے پھاڑنے میں نہیں ہوتی، غزل۔ مضبوطی سہنے میں بھی ہوتی ہے۔"، اس کی بات ابھی مکمل بھی نہ ہو پائی تھی کہ اگلی جانب غزل نے سر افسوس سے نفی میں ہلایا تھا۔

"چچ چچ چچ۔ ایسی فضول باتیں کس نے ڈالی ہیں تمہارے ذہن میں، ضوفی؟ سب کچھ سہہ لینے والے مضبوط نہیں، مجبور ہوتے ہیں۔ انسان کے لیے ہمیشہ کوئی اور نہیں آتا۔ بلکہ ہمیشہ ہی کوئی نہیں آتا انسان کے لیے۔ بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی مدد کو کوئی آئے۔ انسان کو اپنے اوپر ہوئی زیادتی کے خلاف خود کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اپنے اوپر اٹھنے والے ہاتھ کو خود روکنا پڑتا ہے۔ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو خود روکنا پڑتا ہے۔ کسی کے لیے کوئی نہیں آتا۔ انسان کو اپنے لیے ہمیشہ خود موجود رہنا پڑتا ہے۔"، وہ بول کر خاموش ہوئی تو ضوفشاں نے موندی ہوئی نم آنکھیں کھولیں۔ اسی پل چند آنسو پلکوں کی باڑ کو توڑ کر رخسار پر جا پھسلے تھے۔

"تمہیں غلط لگتا ہے، غزل۔ نصیر اچھے ہیں بہت۔ خیال بھی رکھتے ہیں ہمارا۔ہاں بس غصّے کے تھوڑے تیز ہیں۔۔۔"، ابھی وہ مزید بولتی ہی کہ غزل نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"ہاں بس غصّے میں تین چار چماٹ لگا دیتے ہیں۔ کبھی دیوار میں دھکا دے دیتے ہیں۔۔۔ کبھی ہاتھ توڑ دیتے ہیں تو کبھی ہاتھ جلا دیتے ہیں۔۔۔ ورنہ تو بہت اچھے ہیں۔"، غزل نے اس کے نہ کہے جانے والے جملے مکمل کیے تو ضوفشاں کی آنکھیں مزید بھیگنے لگیں۔وہ جتنی بھی کوشش کر لیتی، مگر غزل کی دلیلوں کے آگے ہمیشہ ہار جایا کرتی تھی۔

"تم مجھے ایک بات بتاؤ، ضوفی۔۔۔ تم کیوں سہنا چاہتی ہو؟ کیوں ظلم کے خلاف بولنا نہیں چاہتی ہو؟"، اس نے دوٹوک انداز میں یکدم ہی سوال کیا تو ضوفشاں نے ایک گہرا سانس لیا اور صوفے پر سیدھی ہو بیٹھی۔ نظریں اب بھی کھڑکی سے باہر نظر آتے سرمئی روڈ پر تھیں۔

"میں کم ہمّت ہوں، غزل۔ مجھ میں تمہاری جتنی ہمّت نہیں ہے۔اصل وجہ یہ ہے۔"، وہ بولی تو غزل چند پلوں کے لیے خاموش سی ہو گئی۔کچھ لمحوں بعد ضوفشاں کو اس کی آواز سنائی دی تھی۔

"کوئی بھی انسان پیدا ہوتے وقت ہمّت اپنے ساتھ نہیں لے کر آتا۔ہمّت کرنی پڑتی ہے، ضوفی۔

کیا تمہیں یہ بات گراں نہیں گزرتی کہ تمہارے شوہر کے سلوک سے تمہاری بیٹی کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا؟ کتنی ڈسٹرب رہتی ہوگی وہ اس ظلم کو دیکھ کر؟"، اس نے اب کے پوچھا تو ضوفی کی آنکھوں سے مزید آنسو ٹوٹ کر گرے۔ گلے میں گلٹی دوب کر ابھری تھی۔

"تو ایک بروکن فیملی سے کیا ملے گا اسے؟ ڈائیورسڈ والدین کے بچوں کی زندگی کیسی ہوتی ہے، کیا تم نہیں جانتی؟"

"کم از کم اس زندگی سے تو لاکھ درجہ بہتر ہوتی ہے جو وہ ابھی جی رہی ہے۔"، غزل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اسی پل دروازے کی بیل بجی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نصیر آ گئے ہیں، غزل۔ پھر بات ہو گی۔ اللہ حافظ!"، بولتے ساتھ ہی اس نے فون رکھا تھا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اپنے کمرے میں بیٹھی غزل نے ایک افسردگی بھرا سانس خارج کر کے فون کان سے ہٹایا تھا۔ کیا کرتی وہ؟ کیسے سمجھاتی اسے؟

اس نے چہرہ اٹھا کر دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھا تھا۔ ارحم اور ثمرین کے آنے میں ابھی دس پندرہ

www.novelsclubb.com

منٹ تھے۔

یہیں اگر رمیص جہانزیب کے گھر میں سے ہوتے ہوئے ایمان کے کمرے کی جانب بڑھو تو وہ بستر پر بیٹھی ہاتھوں میں ایک برینڈ نیو موبائل ٹٹول رہی تھی۔ کمرے کی محض ایک لائٹ جلی تھی جس نے کمرے کو کافی حد تک روشن کرر کھا تھا۔ پنکھے کی مدھم آواز اور کھڑکی سے اندر آتی باہر کی تازہ ہواؤں کی آواز سے کمرہ معطر ہوا ہوا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ بارش کی چند ننھی ننھی بوندیں بھی اندر آتی روح کو سکون و تازگی بخش رہی تھیں۔

اس کو یہاں آئے دوسرا مہینہ تھا۔ اس سارے وقت میں اس کی ایک دو بار ہی فاطمہ سے بات ہوئی تھی۔۔۔ وہ بھی اس نے غزل کے موبائل سے بات کی تھی۔ رضیہ بیگم نے جو موبائل اس کو دیا تھا، اس کا تیا پانچہ تو اسی رات ہو گیا تھا جس رات وہ غزل کو ملی تھی۔ سم البتہ اس کے پاس ہی تھی۔ سو اب اس سارے عرصے بعد اس نے بالآخر ایک موبائل خرید لیا تھا۔ اسی قارون کے خزانے سے جو وہ اپنے ساتھ حیدر آباد سے لائی تھی۔ ظاہر ہے، خود تو کمانا شروع کیا نہیں تھا ابھی تک اس نے۔

موبائل میں ابھی ابھی اس نے سم ڈالی تھی اور وہ اب وہ موبائل کھولے پوری طرح سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔اس نے جونہی واٹس ایپ آن کر کے اس کا بیک اپ ریوائیو کیا تو مسیجز کی ایک لمبی قطار سی لگ گئی۔وہ دھیرے دھیرے نیچے کو اسکرول کرتی تمام نام دیکھ رہی تھی،جب یکدم ہی ایک نام پر اس کی آنکھیں ساکت ہوئی تھیں۔حرکت کرتی انگلی تھمی تھی۔سانس چند پلوں کے لیے جیسے رک سا گیا تھا۔

"ارتضیٰ" کے نام سے سیو ہوا وہ نمبر۔۔۔

اس کی چیٹ کے نیچے درج مسیج کی جھلک۔۔۔

چیٹ پر بنا وہ ہرا دائرہ جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس چیٹ پر کئی مسیجز آئے ہوئے ہیں۔۔۔

سب اس کی سانس روک گیا تھا۔اس کی متحرک انگلی نے یکدم ہی چیٹ پر کلک کیا تھا۔تمام ان ریڈ مسیجز اس کی نگاہوں کے سامنے آئے تھے۔

"آنٹی،ایمان کہاں ہے؟"

(شاید وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ نمبر ایمان کی والدہ کے نہیں، خود ایمان کے زیر استعمال ہے)

وہ سانس روکے پڑھتی گئی تھی۔

"آنٹی؟ پلیز جواب دیجیے۔ مجھے ٹینشن ہو رہی ہے۔"، اگلا مسیج پڑھتے ایمان کی آنکھیں نم پڑی تھیں۔ بے اختیار ہی گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

"آپ نے روحان سے بات کی؟"، یہ مسیج اگلے دن کیا گیا تھا۔ وہ چپ چاپ نم آنکھوں سے مسیجز پڑھے گئی تھی۔ اگلا مسیج کچھ دنوں بعد کا تھا۔

"آنٹی؟ پلیز جواب دیجیے۔"، ارتضیٰ کی ایک عادت تھی جو اس نے آج نوٹ کی تھی۔ وہ ٹائپنگ کرتے وقت ایموجیز کا استعمال بالکل نہیں کیا کرتا تھا۔ الفاظ پورے استعمال کرتا تھا۔ کوئی شارٹ ورڈز نہیں۔

اس کے بعد چند مسڈ کالز تھیں۔ وہ اسکرول کرتی جا رہی تھی اور اس کی سیاہ آنکھیں مزید ڈبڈباتی جا رہی تھیں۔ وہ کیسے وہاں جا کر بھی اس کو نہ بھول پایا تھا۔۔۔ کیسے ناں!

www.novelsclubb.com

"ایمان !"،اور یہاں وہ ساکت ہوئی تھی۔اگلے میسج میں اسے مخاطب کیا گیا تھا۔ڈائریکٹلی۔۔۔ مگر اسے کیسے پتا چلا ہو گا کہ یہ نمبر اب اس کے زیر استعمال ہے؟میسج چار ہفتے پرانا تھا۔مگر اسے یوں لگا تھا کہ وہ آج اس کے سامنے کھڑا اسے سیدھا مخاطب کر رہا تھا۔اسے ہمیشہ کی طرح اپنے نرم سے انداز میں مخاطب کر رہا تھا۔

"ایمان۔"،ویسے ہی جیسے وہ اپنے مدھم سے لہجے میں اسے اکثر مخاطب کیا کرتا تھا۔نرمی سے ! چہرہ اپنے مخصوص انداز میں ہلکا سا جھکائے۔۔۔سر کو معمولی سا خم دیے۔

"ایمان؟تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟"،اسے محسوس ہوا جیسے وہ مدھم سے لہجے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے پوچھ رہا ہو۔سوال کر رہا ہو۔جواب کا منتظر کھڑا ہو۔آنسو پلکوں کی نرم باڑ کو پھلانگتے ایک کے بعد ایک بہہ چلے تھے۔آنسو رکتے ہی کہاں تھے؟تھمتے ہی کہاں تھے؟ان کو روکنا اس کے بس میں تھا ہی کہاں؟

"ایمان؟"،اور وہ آخری میسج کل کیا گیا تھا۔وہ ساکت سی بیٹھی رہ گئی تھی۔۔۔بالکل ساکت !

اس کا دل زوروں کا دھڑک رہا تھا۔ دھڑکنوں کی آواز کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ کانوں کی سرخ لوئیں گرم محسوس ہو رہی تھیں۔ رخساروں کو بھگوتے آنسوؤں میں اسے اپنا آپ گھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ روز رات کو اسے یاد کر کے سوتی تھی۔ مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ تو دن میں بھی اسے یاد کیا کرتا تھا۔ وہ تو ہر لمحے اس کے سحر میں جکڑا رہتا تھا۔ ایمان سارا دن انتظار کرتی تھی۔۔۔ رات کا!

رات میں اسے یاد کرنے کا!

وہ سارا دن اسے یاد کرتا تھا! وہ انتظار کرتا ہی کہاں تھا؟

اس کی آنکھیں مزید ڈبڈبا گئی تھیں۔ حلق درد کرنے لگا تھا۔ مناظر کے اوراق پلٹنے لگے تھے۔۔۔ وقت پیچھے جانے لگا تھا۔ حال پر ماضی نے سبقت حاصل کر لی تھی۔ وہ یادوں کے بھول بھلیا میں بھٹکتی خود کو پلنگ پر پیچھے کی جانب پھینک گئی تھی۔ باہر لاؤنج سے ثمرین اور ارحم کی اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھی۔ مگر یہ ساری آوازیں دور کہیں پس منظر میں چلی

گئی تھیں۔اس نے متورم آنکھیں موند لی تھیں۔

(ماضی۔۔۔

وقت تھا مغرب کا۔ شہر تھا حیدر آباد۔ مقام تھا مراد منزل۔ مراد منزل کے باہر لگی گھنٹی پر کوئی ہاتھ رکھ کر جیسے ہٹانا بھول ہی گیا تھا۔ زرینہ بی نے جلدی جلدی سر پر دوپٹہ اوڑھا تھا اور دروازہ کھولنے لپکی تھیں۔

"ارے کون ہے بھئی؟ گھنٹی سے ہاتھ تو ہٹالو۔"، وہ جلد باز سے انداز میں بولتی ہوئی دروازے تک پہنچی تھیں۔دروازے کا لاک ہٹا کر انہوں نے دروازہ وا کیا تو سامنے ہی وہ کھڑی نظر آئی۔

سادہ سے بھورے رنگ کے شلوار قمیض پہنے، ہم رنگ دوپٹہ سر اور شانوں پر پھیلائے وہ ہاتھ میں ڈھکی ہوئی ٹرے لیے کھڑی تھی۔ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔آنکھوں میں خوشی رقصاں تھی۔

"السلام علیکم آنٹی۔"،اس نے خوش دلی سے کہا تو انہوں نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

"تم نے میری دوڑ لگوادی، ایمان۔۔۔ حد ہے۔۔۔"، وہ سر نفی میں ہلاتی بولیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"وعلیکم السلام کہنا تھا، آنٹی۔"، اس نے ہنس کر کہا تو ان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔ پھر سر جھٹکتی ہوئی وہ ایک طرف کو ہوئیں اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازہ پیچھے سے بند کیا اور اس کے پیچھے پیچھے ہی اندر تک آئیں۔

"کتنی بار کہا ہے کہ یہ آنٹی شانٹی نہ بولا کرو مجھے۔ خالہ کہا کرو۔"، نہایت اپنائیت سے کہتیں وہ اس کے پیچھے ہی کچن میں داخل ہوئی تھیں۔ ایمان نے ہاتھ میں تھامی ٹرے سیدھا ڈائننگ ٹیبل پر رکھی تھی، پھر کرسی گھسیٹ کر وہیں ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

"اوکے۔۔۔ خالہ جان۔۔۔ آج میں نے اپنے ہاتھوں سے بیسن اور سوجی کا حلوہ بنایا ہے۔ ابھی ابھی کھا کر بتائیں کہ کیسا بنا ہے۔"، اس نے ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھ کر مسکرا کر کہا تو زرینہ کو بھی حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا۔

"یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ کیا واقعی؟ تم نے کیسے کچن میں قدم رکھ لیے، ہاں؟"، وہ حیرت سے

قریب آتیں اب حلوے پر ڈھکی ٹرے ہٹا رہی تھیں۔ اندر ایک کانچ کی بے رنگ پلیٹ میں اچھا خاصہ حلوہ رکھا تھا۔ حلوے کی دلسوز مہک پورے کچن میں پھیل گئی تھی۔ انہوں نے سانس اندر کو کھینچ کر مہک اپنے اندر اتاری تو مسکرا اٹھیں۔

"خوشبو تو بڑی اچھی آرہی ہے۔۔۔ ہمم۔"، بولتی ہوئیں وہ مڑ کر برتنوں کے ریک تک گئی تھیں اور اس میں لٹکے دو چمچ لیتیں واپس اس تک آئی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی کرسی کھینچ کر بیٹھیں اور حلوہ اپنے نزدیک کیا۔

"تم نے کیسے بنایا حلوہ؟"، پوچھتے ہوئے انہوں نے چمچ میں حلوہ بھر کر منہ میں رکھا تو جیسے ان کی آنکھیں کھل اٹھیں۔ ستائشی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے ابرو اچکائی تھی۔

"واہ بھئی، ماشاءاللہ۔ بہت لذیذ۔۔۔ بہت عمدہ۔"، ایمان کی تو باچھیں ہی کھل گئی تھیں۔ آگے بڑھ کر اس نے دوسرا چمچ اٹھا کر حلوہ کھایا تھا۔ آنکھیں اسی پل بے یقینی سے پھیلی تھیں۔

"خالہ۔۔۔ یہ تو واقعی بہت ذائقہ دار بنا ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ میں نے بنایا ہے یہ۔۔۔ اف، محبت ہو گئی ہے اپنے ہاتھوں سے۔"، وہ چمکتی آنکھیں لیے بولی تو زرینہ مسکرا اٹھیں۔

"جانتی ہیں، خالہ؟ یوٹیوب سے ترکیب دیکھ کر بنایا ہے۔۔۔دل چاہ رہا تھا کھانے کا مگر امی بنا کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔ سو خود ہی تجربہ کرنے لگ گئی۔"، وہ کہتے ہوئے ہنسی تو زرینہ بھی ہنس دیں۔

"اچھا ایسے کرو کہ شان بیٹھا ہے اوپر۔۔۔اس کو بھی دے آؤ تھوڑا نکال کر۔۔۔ مجھ سے بار بار سیڑھیاں نہیں چڑھی جاتیں ناں۔۔۔ان گھٹنوں نے تو کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔"، وہ بولیں تو وہ فوراً سعادت مندی سے سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ علیحدہ پیالی میں تھوڑا حلوہ نکالا اور اوپری زینے کی جانب بڑھ گئی۔ سر پر دوپٹہ درست کرتی ابھی وہ اوپری منزل پر پہنچی ہی تھی کہ یکدم ہی رکی۔

سامنے سے وہ کسی سے فون پہ بات کرتا ہوا اسی کی جانب چلا آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک دم ہی رکا۔ چند الوداعی کلمات کہہ کر اس نے فون رکھا اور پینٹ کی جیب میں اڑسا۔ ایمان بھی ٹھہر سی گئی تھی۔ وہ چند قدم چلتا اس کے کچھ قریب آکر کچھ فاصلے پر رک گیا تھا۔ نظریں اسی پر جمی تھیں۔

www.novelsclubb.com

"خیریت سے آئی ہو؟"، ابرو اچکا کر اپنے ازلی مدھم سے لہجے میں پوچھا گیا۔

"حلوہ لے کر آئی ہوں۔ شان کو دینے جا رہی ہوں۔"، اس نے ہاتھ میں پکڑی پیالی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تو وہ آنکھیں سکیڑ گیا۔

"آنٹی نے بنایا ہے؟"، اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو ایمان نے لب بھینچے۔ ابھی وہ کچھ کہتی ہی کہ وہ مزید بول پڑا۔ "تم تو نالائق ہو۔ بنا نہیں سکتی۔"، اس نے واضح طور پر اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔

"جی نہیں۔۔۔ میں نے بنایا ہے۔ تم ہٹو سامنے سے۔"، بول کر وہ اس کی ایک جانب سے آگے جانے لگی تو وہ یکدم ہی اس کے سامنے آ گیا۔

www.novelsclubb.com

"شان کو کیوں دے رہی ہو؟"، ابرو اچکا کر اسی سنجیدہ لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

"میری مرضی۔"، اس نے ایک ادا سے جواب دے کر اس کے ساتھ سے گزر جانا چاہا تھا کہ وہ یکدم ہی ایک قدم پیچھے ہو کر پھر سے اس کے سامنے آ گیا۔

"سو تو ہے۔"، بولتے ہوئے وہ یکدم ہی آگے بڑھا تھا اور ایک ہی جست میں اس کے ہاتھ سے

حلوے کی پیالی اچکی تھی۔ وہ ہکّا بکّا سی کھڑی رہ گئی تھی۔ اب وہ بہت مزے سے چمچ سے حلوے کا پہلا نوالہ لے رہا تھا۔

"کیوں کھا رہے ہو اب نالائق کے ہاتھ کا بنا ہوا حلوہ؟"، اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کڑی تیوریاں چڑھا کر پوچھا تو ارتضی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا تم نے بنایا ہے یہ؟ واقعی؟"، وہ واقعی حیرت زدہ سا ہو گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ تو تمہیں کیا میری صلاحیتوں پر کوئی شک ہے؟"، اس کے پوچھنے پر ارتضی نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"شک ہی شک ہے، ایمان۔ شک ہی شک ہے۔"، وہ لہراتے انداز میں بولتا اسے تپا گیا تھا۔

"لاؤ دو پھر واپس۔"، اس نے غصّے کے عالم میں پیالی اس کے ہاتھ سے لینی چاہی تو اس نے فوراً سے ہاتھ اوپر کر لیا۔ اب ایک تو وہ ٹھہرا لمبا کھمبا، اوپر سے ایمان چھوٹی سی۔۔۔ بیچاری لاکھ کوششیں کر لیتی تب بھی اگلے ہزار سالوں میں بھی پیالی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ضبط سے ایک گہرا سانس لیتی وہ مڑی تھی اور قدم نیچے کی جانب بڑھائے تھے۔۔۔ جبھی وہ پیچھے سے پکار اٹھا

تھا۔

"ایمان۔"

اف! اس کا یہ انداز۔۔۔جب وہ اسے پکارتا تھا تو اس کے لہجے میں نرمی ہی ایسی ہوتی تھی کہ وہ بالکل بے بس ہو کر رہ جاتی تھی۔

"یہ لو۔دے دو شان کو۔"،اس کے مڑنے پر اس نے پیالی پھر سے اس کی جانب بڑھائی تھی۔

ایمان نے دھیرے سے ہاتھ آگے بڑھا کر پیالی تھامی تھی، پھر سر جھٹکتی اس کے ساتھ سے ہوتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

"حلوہ بڑا مزے دار ہے، ایمان صاحبہ۔"، پیچھے سے اس نے مسکراتے لہجے میں داد دی تو وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"آپ کے ہاتھوں میں تو جادو ہے۔۔۔بلکہ آپ خود ایک سحر ہیں جو مجھے ہمیشہ سحر زدہ کیے رکھتی ہیں۔"،اس نے مدھم سے لہجے میں معنیٰ خیزی سے کہہ کر رخ موڑا تھا اور قدم آگے بڑھا

گیا تھا۔ پیچھے وہ نجانے کتنے ہی پلوں تک یونہی ساکت کھڑی رہی تھی۔)

اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک بار پھر بستر پر لیٹا پایا۔ باہر بارش اب تک چل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی برسات جاری تھی۔ دل میں جدائی کا درد اٹھا تھا۔ تکلیف خطرناک تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر خود کو کمپوز کرنے کی سعی کی تھی۔ ارتضی مراد کی یادیں یونہی تکلیف دیا کرتی تھیں۔۔۔ اذیت سے دوچار کیا کرتی تھیں! کیا کرتی وہ؟ نہ اسے بھول سکتی تھی نہ یاد رکھ سکتی تھی؟

☆☆☆

شام نے اپنے پر کراچی پہ پھیلا دیئے تھے مگر یہ برسات تھی کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ نجانے کہاں سے یہ بھولے بسرے بادل آ پہنچے تھے جو پھر سے اتنی تیز بارش برسنے لگی تھی۔ رمیص جہانزیب کے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ایسے میں کچن سے کھٹ پٹ کی آواز آتی تھی۔ اندھیر پڑے گھر کو محض کچن کی ہی یہ بتّی نیم

روشن کیے ہوئے تھی۔ غزل کچن میں کھڑی اپنے لیے کافی بنا رہی تھی۔ سادہ سے شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ ہی دوپٹہ سر اور شانوں پر پھیلائے وہ بڑی فرصت سے کافی پھینٹ رہی تھی جب یکدم ہی اس کا سر بری طرح چکرایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اس نے بے اختیار ہی سلیب کو زور سے تھاما تھا۔

چند پلوں تک آنکھیں میچے رہنے کے بعد اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولی تھیں۔ یکدم ہی متلی سی ہونے لگی تھی۔ اسی پل ایمان کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ ہاتھ پہلو میں لہراتی، سر جھکائے خاموش قدم اٹھاتی کچن کی جانب بڑھ رہی تھی۔ چہرے پہ سنجیدگی چھائی تھی۔ لب ایک سیدھی لکیر میں بند تھے۔ کچن تک پہنچ کر اس نے سر اٹھایا۔

"غزل؟ کیا کر رہی ہیں؟"، اس نے عام سے انداز میں فریج تک جاتے ہوئے پوچھا تو غزل نے ایک گہرا سانس لے کر چہرہ اس کی جانب موڑا۔ اسے اس کی سوجی آنکھیں بخوبی نظر آئی تھیں۔ البتہ آنکھوں کا گلابی پن اسے نظر نہیں آیا تھا کیونکہ اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا۔

"کافی بنا رہی ہوں۔ تم پیو گی؟"، اس نے اس سے پوچھا تو ایمان نے سنجیدگی سے سر نفی میں ہلا

دیا۔اب وہ فریج سے بوتل نکالے، کاؤنٹر پر گلاس رکھے اس میں پانی انڈیل رہی تھی۔ غزل سر ہلاتی پھر سے کافی کی جانب مڑ گئی تھی۔

جبھی یکدم ایک بار پھر اس کا سر بری طرح چکرایا تو اب کہ اس نے بیٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔وہ کافی کا مگ ہاتھ میں تھامے میز تک آئی تھی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔اب وہ نہایت سست روی سے مگ میں چمچ گھما رہی تھی۔ایمان نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے، غزل؟"، نجانے کیوں اس نے یہ پوچھ لیا۔غزل نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ایمان کو تسلی پھر بھی نہیں ہوئی تھی۔آگے بڑھ کر اس نے فوراً سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو بدک کر پیچھے ہوئی۔

"آپ کو تو تیز بخار ہے، غزل۔"، غزل نے یوں سر ہلایا تھا گویا اسے پہلے سے معلوم ہو۔ایمان نے لب بھینچے تھے۔

"اتنے تیز بخار میں یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟ مجھ سے کہہ دیتیں۔میں بنا دیتی آپ کے لیے کافی۔۔۔اور۔۔۔اور دوائی لی آپ نے یا وہ بھی نہیں لی؟"،اس نے اس کے ہاتھ سے مگ لیتے

ہوئے خفگی کے عالم میں کہا تو غزل نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہاں لی ہے دوائی۔ صبح سے ہلکا ہلکا تھا بخار۔ اب اچانک ہی تیز ہوا ہے۔"، اس نے لاپرواہی سے کہا تھا۔ ایمان کو اس پر بہت غصّہ آیا تھا۔

"ڈاکٹر کے پاس چلیں میرے ساتھ۔"

"اس موسم میں؟"، غزل نے یکدم ہی کھڑکی سے نظر آتی تیز بارش کی جانب اشارہ کیا تو ایمان نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"جب بخار موسم نہیں دیکھتا تو ہم کیوں دیکھیں؟"، اور یہاں غزل دھیرے سے مسکرائی تھی۔

"ہاں چلتی ہوں۔ مجھے بھی لگ رہا ہے کہ جانا ہی پڑے گا ڈاکٹر کے پاس۔"، وہ سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تو ایمان نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ چلو وہ مانی تو سہی چلنے کے لیے۔ ابھی غزل نے کچھ قدم اور بڑھائے ہی تھے کہ یکلخت ہی اس کا سر اس بری طرح چکرایا کہ وہ لڑکھڑا گئی۔ اگرجو ایمان بر وقت اسے نہ تھامتی تو وہ زمین بوس ہو چکی ہوتی۔

"آپ کی طبیعت زیادہ خراب لگ رہی ہے مجھے۔۔۔ یہاں بیٹھیں۔"، وہ پریشانی سے کہتی ہوئی

اسے کرسی پر بٹھاتی اندر کی جانب بھاگی تھی۔ ساتھ ثمرین کو بھی تین چار آوازیں لگائی تھیں۔

ثمرین بھی فوراً ہی دوڑی چلی آئی تھی۔

ایمان تیزی سے کمرے سے نکلتی ہاتھ میں دو بڑی چادریں اور غزل کا دوپٹہ اور نقاب لے آئی تھی۔ اس کے انداز میں عجلت سی تھی۔ ثمرین غزل کے ساتھ کھڑی اس کی ہتھیلیاں سہلا رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ ایمان کو کچھ بتانے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔

" ثمرین۔۔۔ سب سے پہلے بہادر بھائی کو کال کر کے کہو کہ فوراً گاڑی نکالیں۔ میں غزل کو لے کر ہسپتال جا رہی ہوں۔ تم ارحم کے پاس یہیں ٹھہرو۔۔۔ اور ہاں، ارشد صاحب کو بھی کال کر کے بلا لو۔ گھر پر اکیلی ہو جاؤ گی تم۔"، بولتے ہوئے وہ عجلت میں غزل کو نقاب اور چادر اوڑھانے لگی تھی۔

سب کچھ جیسے کسی سلو موشن فلم کی مانند ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسے سہارا دیے باہر گاڑی تک لائی

www.novelsclubb.com

تھی۔۔۔اب گاڑی مین روڈ پر گامزن تھی۔۔۔وہ غزل کے ہاتھ تھامے اس کا بخار چیک کر رہی تھی۔وہ اب بھی بخار میں پھنک رہی تھی۔۔۔گاڑی ہسپتال کے باہر رکی تھی۔۔۔اب وہ لوگ ہسپتال کے اندر جا رہے تھے۔۔۔غزل وہیل چیئر پر بیٹھی تھی جسے ایمان گھسیٹتی آگے ہی آگے لے جا رہی تھی۔اس کے آگے پیچھے ایک دو وارڈ بوائز اس کے ساتھ ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔بہادر بھائی بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔۔۔اب وہ نشستوں میں سے ایک پر سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔۔۔اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے جا رہے تھے۔اسے لگتا تھا کہ اب شاید اس کی زندگی میں ایک ہی انسان اور ایک ہی دعا بچی ہے۔اسے غلط لگتا تھا۔آج اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی چھوٹی سی، محدود سی زندگی میں غزل بھی اپنی اہمیت ثبت کر چکی تھی۔وہ نہایت غیر محسوس سے انداز میں اس کی زندگی میں بہت اہمیت حاصل کر گئی تھی۔۔۔اب وہ ڈاکٹر کے سامنے کھڑی ان کے بولنے کی منتظر تھی۔۔۔ڈاکٹر کچھ کہہ رہی تھی۔۔۔اور جو وہ کہہ رہی تھی، وہ ایمان کا سانس سوکھا دینے کے لیے کافی تھا۔۔۔وہ ریسیپشن ڈیسک کے پاس کھڑے بہادر بھائی کے پاس گئی تھی۔۔۔وہ اب پریشانی کے عالم میں بہادر بھائی سے کچھ کہہ رہی

تھی۔وہ سر ہلاتے باہر کی جانب دوڑے تھے۔۔۔اب وہ فون کان سے لگائے کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔۔۔اگلی جانب سے کچھ کہا گیا تھا جس پر اس نے بے اختیار ہی سر اثبات میں ہلایا تھا۔۔۔

☆☆☆

ہسپتال کے اس کمرے میں بالکل گہری خاموشی چھائی تھی۔اس خاموشی میں مدھم سا خلل محض ڈرپ کے مائع کے ٹپکنے سے پڑتا تھا۔ہسپتال کی دیواروں کے سپیدی اس کے چہرے کی سپیدی کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔اس کا پرائیویٹ کمرہ تھا۔وہاں کسی بھی مرد کو آنے سے سختی سے منع تھا۔ایمان نے خاص غزل کے لیے یہ پرمیشن لی ہوئی تھی۔اس کے سیاہ گھنے بال تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ہسپتال کے سفید گاؤن میں وہ بھی سفید ہی لگتی تھی۔بالکل کسی برف کے مجسمے کی مانند!

جبھی بہت ہی دھیرے سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا گیا تھا۔کوئی اندر داخل ہوا تھا۔دروازہ

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ پھر سے چوکھٹ سے جا لگا تھا۔ کسی کے قدموں کی نرم سی چاپ کمرے میں گونجی تھی۔ کوئی قدم قدم چلتا اس تک آ رہا تھا۔ بالآخر قدم اس کے پلنگ کے قریب رکے تھے۔ کسی نے بہت ہی نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ ہاتھ سخت سا تھا مگر اس کے لیے ہمیشہ نرم پڑ جاتا تھا۔ غزل کی یکدم ہی ایک جھٹکے سے آنکھیں کھلی تھیں۔ چہرہ موڑ کر اس نے نہایت بے یقینی سے اپنے برابر میں کھڑے شخص کو دیکھا تھا۔

سنہری پر کشش آنکھیں۔۔۔ سنہری بھورے سے ماتھے پر بکھرے بال۔۔۔ سنہری و سپید سی دمکتی رنگت۔۔۔ حسین چہرہ۔۔۔ اس کا پسندیدہ چہرہ۔۔۔ اس کے پسندیدہ شخص کا چہرہ۔۔۔ وہ سنہری آنکھوں میں ڈھیروں نرمی لیے اسے تک رہا تھا۔ لبوں پر ایک ہلکی نرم گرم سی مسکراہٹ تھی۔ غزل کی آنکھوں میں بے اختیار ہی بہت سی نمی ابھر آئی تھی۔ یقین چاہ کر بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے وہ کھڑا ہے۔۔۔ وہی۔۔۔ اس کا سنہری آنکھوں والا سلطان!

"تم نے ہمّت ہار دی، غزل؟"، وہ بہت مدھم آنچ دیتے لہجے میں دھیرے سے بولا تو غزل کی آنکھوں سے ایک آبشار سی بہہ چلی تھی۔ وہ یک ٹک اس حسن کے پیکر کو دیکھ رہی تھی جس کی

آنکھوں میں اب ایک نرم سی خفگی تھی۔ لہجہ ویسا ہی تھا جیسا ہوا کرتا تھا۔ نرم گرم سا۔۔۔ کسی نرم آغوش سا!

"میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ تم اپنا خیال رکھنا؟ تم نے میری بات نہیں مانی۔۔۔"، وہ اب افسردگی اور مایوسی کے سے انداز میں سر نفی میں ہلا رہا تھا۔ غزل اسے متورم گلابی پڑتی آنکھوں سے یک ٹک تکتی جا رہی تھی۔ الفاظ کہیں دور جا سوئے تھے۔ محض آنکھیں ہی بچی تھیں۔ اور آنکھیں تو دل کا حال کہہ دیا کرتی ہیں ناں!

"تم اہم ہو میرے لیے۔۔۔ تم، ہمارا بیٹا، ہماری بیٹی۔۔۔ 'میرے' لیے تمہیں 'اپنا' خیال رکھنا ہے، غزل۔ تمہیں میرے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔۔۔ یوں ہمّت تو نہیں ہارنی؟"، بولتے ہوئے اس نے نرمی سے سر نفی میں ہلایا تھا۔ غزل نے بہت ہی دھیرے سے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اسے وہ کوئی خواب لگ رہا تھا۔۔۔ ایسے جیسے ہاتھ اس تک پہنچے گا تو وہ ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ آہستگی سے اس کی جانب بڑھتا ہاتھ یکدم ہی اس نے تھام لیا تھا۔ غزل کے جسم میں ایک لہر سی دوڑی تھی۔۔۔ آنسوؤں میں مزید روانی آئی تھی۔ وہ تھا! وہ واقعی وہیں تھا!

ایسا کیسے ممکن تھا؟اس نے تو سنا تھا کہ مرے ہوئے لوگ واپس نہیں آیا کرتے۔ مگر پھر وہ کیسے آ گیا تھا؟

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أموات بل احياء ولكن لا تَشْعُرُونَ

"اور اللہ تعالی کی راہ کے شہیدوں کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے۔"

قریب کہیں سے ہی گونج اٹھی تھی۔ آواز رمیص کی تھی۔ الفاظ اس کے رب کے تھے۔ غزل کا روتا وجود ساکن پڑا تھا۔ وہ ساکت ہوئی تھی۔ شاید اس کی آنکھوں سے بہتے اشک بھی ساکت ہوئے تھے۔ سامنے کھڑا رمیص مسکرایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نرم اور گہری تھی۔

"تو کیا تم نے مجھے مردہ سمجھ لیا تھا؟"، اس نے سر ہلکا سا جھکا کر نرمی سے پوچھا تو غزل کا سر بے اختیار ہی نفی میں ہلتا چلا گیا تھا۔ آنسو ایک بار پھر شدّت اختیار کر چکے تھے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ

اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، ہر گز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ

ہیں روزی پاتے ہیں۔

یہ آواز بھی رمیص کی تھی۔ الفاظ ایک بار پھر اس کے رب کے تھے۔ اسے آج سمجھ آئی تھی کہ رمیص ہر وقت یہ آیات کس دن کے لیے دہراتا رہتا تھا۔ سامنے کھڑا رمیص اب ہلکے سے مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ نرمی سے اس پر جھکا تھا۔ ہاتھ اب تک اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اب وہ دوسرے ہاتھ سے بہت دھیرے سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"تمہیں ہمّت کرنی ہے، غزل۔ میرے لیے، اپنے لیے، ارحم کے لیے، ارحہ کے لیے، بابا کے لیے۔۔۔ میرے مقصد کے لیے۔۔۔ اپنے سکون کے لیے۔۔۔ تمہیں ہمّت کرنی ہے۔"، وہ نرمی سے اس کے بال سہلاتا جا رہا تھا۔ غزل ڈبڈبائی آنکھیں لیے اسے سنتی جا رہی تھی۔ اتنے میں رمیص نے بہت دھیرے سے اپنے ہاتھ میں قید اس کے ہاتھ کو چھوڑا تھا۔ اس کا دل یکدم ہی بے چین ہوا تھا۔ کیا وہ پھر اسے چھوڑ کر جا رہا تھا؟ پہلے کی طرح؟

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا، غزل۔ میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ شروع سے۔۔۔ تم میری موجودگی کو بارہاں ایسے ہی محسوس نہیں کرتی ہو۔۔۔ میں ہوں تمہارے ساتھ۔ میں پھر آؤں

گا۔ تمہارے پاس۔۔۔اللہ حافظ !"،اور بولتے بولتے ہی اس کی پرچھائی ہوا میں تحلیل ہونے لگی تھی۔ مگر غزل اس کے الفاظ پر برف کا مجسمہ بنی تھی۔اس کی بات نے اس کے اندر کے اضطراب پر نجانے کیسے مگر ایک ہلکی سی پھوار برسائی تھی۔

"'رمیص۔۔۔"،وہ مدھم سی آواز میں بولی تھی۔ وہ اب ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔اس کا عکس غائب ہو رہا تھا۔

"رمیص،مت جاؤ۔"،اس کے آنسو بے قابو تھے۔ مگر وہ جا رہا تھا۔اندر، کہیں بہت اندر وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔اس کے ساتھ رہے گا۔

"رمیص۔"،اس کی ہچکی سی بندھ گئی تھی۔اس کی آواز بے حد مدھم سی تھی،اتنی کہ شاید بمشکل ہی اس کے اپنے کانوں تک پہنچ رہی ہو گی۔ وہ اس کو دیکھ رہی تھی۔پرچھائی غائب ہو چلی تھی۔

"رمیص۔"،اور یکدم ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔وہ ہسپتال کے اسی کمرے میں تھی۔۔۔ مگر اب وہاں کوئی رمیص نہ تھا۔اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ بالکل تر۔کمرے میں اس کے علاوہ اور

www.novelsclubb.com

کوئی نہ تھا۔۔۔وہ وہاں اکیلی تھی۔۔۔ مگر دل۔۔۔یہ دل اکیلا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔دل میں ایک ٹھہراؤ سا در آیا تھا۔ نجانے کیسے۔۔۔ نجانے کہاں سے۔۔۔بس سکون سا تھا۔سکوت سا تھا۔ ٹھہراؤ سا تھا۔

اس نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ صاف کیا تھا۔اسی پل دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹا کر ایمان اندر داخل ہوئی تھی۔یونہی لیٹے لیٹے غزل نے اسے نم پڑتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔چہرے پر مٹے مٹے سے آنسوؤں کے نشانات خوب واضح تھے۔غزل کو جاگتا دیکھ کر وہ ایک پل کو ٹھہری تھی، پھر سر جھٹکتی اندر بڑھ آئی تھی۔

اس کے قریب پہنچ کر اس نے کرسی گھسیٹی تھی اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

غزل اسے ہی دیکھ رہی تھی۔گلابی پڑتی آنکھوں سے۔

"ڈاکٹر کہہ رہی تھیں کہ بے بی کی جان کو رسک ہے۔"، وہ دھیرے سے بولی تو غزل کی آنکھوں میں تفکر ابھرا۔اس پل اس کو اپنی جان فنا ہوتی محسوس ہوئی تھی۔دل بہت زور کا

www.novelsclubb.com

دھڑکا تھا۔

"آپ کا بخار بہت تیز ہو گیا تھا۔اللہ اللہ کر کے کم ہوا ہے۔۔۔مزید رسک نہیں لے سکتے۔"،وہ نرمی سے،دھیرے دھیرے مدھم لہجے میں بول رہی تھی۔غزل بھیگی آنکھیں لیے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔سن پڑا وہ کمرہ اسے اس لمحے جان لیوا محسوس ہوا تھا۔یہ سفیدی اسے گھٹن میں مبتلا کرنے لگی تھی۔

"میرے اللہ۔"،اس نے بولتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔چہرہ دوسری جانب پھیر کر چند گہرے سانس لیے تھے۔

"آپ کو ہمّت کرنی ہو گی،غزل۔اپنے لیے۔۔۔اپنے بچوں کے لیے۔"،ایمان نے نرمی سے کہا تو غزل نے چہرہ یکلخت ہی اس کی جانب پھیرا۔ذہن میں کچھ دیر پہلے کے کچھ الفاظ گونجے تھے۔

"تمہیں ہمّت کرنی ہے،غزل۔میرے لیے،اپنے لیے،ارحم کے لیے،ارحہ کے لیے،بابا کے لیے۔۔۔میرے مقصد کے لیے۔۔۔اپنے سکون کے لیے۔۔۔تمہیں ہمّت کرنی ہے۔"

وہ نجانے کتنے ہی لمحوں تک اسے تکے گئی تھی۔۔۔خاموش بھیگی نظروں سے!

اگر ہسپتال کے اس سکوت بھرے کمرے کے باہر جھانکو تو بارش اب تک ہو رہی تھی۔ بادل آج جانے کا ارادہ کر کے نہ آئے تھے شاید!

☆☆☆

نجانے کتنے ہی لمحے بیتے تھے، کتنے ہی پل گزرے تھے۔ فجر طلوع ہونے کو تھی۔ بارش اب کافی حد تک تھم چکی تھی۔۔۔البتہ ہلکی ہلکی پھوار اب تک جاری تھی۔ وہ منتظر و متفکر سی او ٹی کے باہر بیٹھی تھی۔ بہادر بھائی کو ڈاکٹر نے میڈیکل اسٹور بھجوایا تھا۔ وہ اس وقت وہاں بالکل اکیلی تھی۔ یوں ہسپتال کے اس مخصوص حصے میں مردوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ایمان نے چہرہ آپریشن تھیٹر کی جلی ہوئی سرخ بتی کی جانب اٹھا رکھا تھا۔ پیر لاشعوری طور پر اضطرابی کیفیت میں ہلاتی، وہ دوپٹہ چہرے کے گرد باندھے ہوئی تھی۔ ہلتے لب مسلسل کچھ نہ کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

جبھی آپریشن تھیٹر کی سرخ بتیاں بجھی تھیں۔ سرخ بتیوں کی جگہ سبز روشنی نے لے لی تھی۔ کچھ ہی پلوں بعد تھیٹر کے دونوں دروازے جدا ہوئے تھے۔ڈاکٹر ٹیم سمیت باہر آئی تو وہ یکدم ہی تیزی سے اٹھی تھی۔چند قدم ڈاکٹر کی جانب بڑھائے تھے۔ باقی کے قدم ڈاکٹر ہی اس تک طے کر آئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی، ڈاکٹر خود ہی مسکرا کر بول پڑی تھی۔

"ماشاءاللہ سے بہت ہی صحتمند بیٹی ہوئی ہے۔ماں بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ابھی انہیں روم میں شفٹ کیا جا رہا ہے۔ پھر آپ ان سے مل سکتی ہیں۔"، نہایت پیشہ ورانہ شائستگی سے بولتیں ڈاکٹر اگلے ہی پل سر کو ہلکا سا خم دیتی وہاں سے جا چکی تھیں۔ایمان نے شکر کا کلمہ ادا کیا تھا۔بے اختیار ہی وہ ایک گہرا پر سکون سانس خارج کرتی پیچھے ہوتی نشست پر ڈھے جانے کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ رب کا جتنا شکر ادا کرتی، اتنا کم تھا۔

چند ہی لمحوں بعد ایک معمر نرس ہاتھوں میں ننھا سا ہلتا جلتا وجود تھامے او ٹی کے دروازوں سے باہر آئی تھی۔اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔ایمان نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تو بے اختیار

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نظریں اس ننھے سے گلابی وجود کے ہلتے جلتے گلابی ہاتھوں کی جانب اٹھی تھیں جو سفید چادر کی اوٹ سے نظر آرہے تھے۔اس کی آنکھوں میں نجانے کہاں سے ڈھیر ساری نمی امڈ آئی تھی۔

نرس اب بچی اسے تھمارہی تھی جسے اس نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ تھام لیا تھا۔اور اس کا چہرہ اب کے اس کے سامنے آیا تھا۔گلابی و سپید سی کھلی کھلی رنگت، ننھے ننھے ہاتھوں کو بھینچے، ہیزل رنگ آنکھوں کی ٹکٹکی باندھے وہ بہت حیرت سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ایمان نم آنکھوں کے ساتھ ہی اس کے دیکھنے پر ہنس پڑی تھی۔اف کتنی پیاری تھی وہ!

"ماشاءاللہ۔"، بے ساختہ ہی اس کی زبان سے پھسلا تھا۔وہ چہرہ جھکائے اسے نرم نظروں سے تک ہی رہی تھی جب دو نرسیں ایک اسٹریچر گھسیٹتی او ٹی کے دروازوں سے باہر آئی تھیں۔ اسٹریچر پر دوپٹہ بالوں اور شانوں پہ ڈالے غزل لیٹی تھی۔وہ ہوش میں ہی تھی۔آنکھیں کھول رکھی تھیں جن سے اس پل آنسوؤں کی ایک قطار سی بہتی چلی جارہی تھی۔

یہ ہسپتال کا وہ خصوصی حصّہ تھا جسے خواتین کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ یہاں سے کسی مرد کا گزر ناممکن سی بات تھی۔ ایمان بچی کو ہاتھ میں تھامے بے ساختہ ہی اس پر جھکی تھی جواب متورم آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"شکریہ ایمان۔"، اس نے بہت ہی مدھم آواز میں دھیرے سے کہا تو ایمان ہولے سے مسکرا دی۔ وہ اس کے شکریہ کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ ایمان نے ہلکا سا مسکرا کر نہایت نرمی سے سر کے خم سے اس کے شکریہ کا جواب تھمایا تھا۔ غزل متورم گلابی پڑتی آنکھوں کے ساتھ ہی مسکرا دی تھی۔ نرسیں اب اسے روم تک لے کر جا رہی تھیں۔ وہ وہیں کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی بانہوں میں حرکت کرتا وہ وجود اب بھی ہاتھ پیر مارتا، اسے تکنے میں مصروف تھا۔ اسے شاید اس نئی دنیا میں آتے ہی یہ لڑکی بے حد پسند آ گئی تھی!

☆☆☆

فجر طلوع ہوتے ہی ارشد صاحب کے ہمراہ ارحم اور ثمرین بھی ہسپتال چلے آئے تھے۔ اس نے

انہیں فون پر ہی اطلاع دے دی تھی۔ ہسپتال کے اس پرائیویٹ روم کا منظر کسی اجلی اجلی سی صبح کے جیسا تھا۔ پر سکون۔ تازگی بخش۔ سکون بخش۔

غزل بستر پر تکیوں کے سہارے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بانہوں میں بچی کو بھرے وہ نم آنکھوں سے ہر کچھ لمحوں بعد اس کا چہرہ چومتی تھی۔ ارحم بھی اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھا تھا۔ سنہری نگاہیں معصومیت سے اپنی ماں کی گود میں موجود اپنی چھوٹی بہن پر ٹکی تھیں۔

بستر کے داہنے جانب رکھے ڈبل صوفے پر ارشد صاحب اور ثمرین بیٹھے تھے جبکہ بائیں جانب رکھے ڈبل صوفے پر ایمان بیٹھی تھی۔ غزل نے اب کے مسکراتی نم آنکھوں کو اسی کی جانب موڑا تھا۔ اس کے دیکھنے پر ایمان مسکرائی تھی۔

"تمہارا شکریہ، ایمان۔۔۔ یوں ایک ایک لمحے میرے ساتھ ہونے کے لیے۔"، اس نے نہایت نرمی سے کہا تو ایمان نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی تھی۔

"شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، غزل۔ یہ میرا فرض تھا۔"، اس نے کہا تو غزل چند ثانیے کو اسے یونہی تکے گئی۔ پھر مسکرا کر ایک نظر ارحم کو دیکھنے کے بعد چہرہ ارشد صاحب کی جانب

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

پھیرا۔وہ بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔آنکھوں میں ان کی بھی نمی ٹھہری تھی۔نم تو ان سب کی آنکھیں ہی تھیں۔اور میں نے کہا ناں کہ کسی ایک انسان کی غیر موجودگی اکثر بہت سوں کی موجودگی پر ہاوی رہتی ہے۔وہاں ایک رمیص نہیں تھا۔اور لگتا تھا کہ وہاں تو کچھ ہے ہی نہیں!

یہ پل بہت ہی حساسیت سے پر تھا۔سب کے لیے! خاص طور پر غزل کے لیے!

اور اس ایک حساس پل میں رمیص کی ہی کمی تھی۔۔۔وہ خود میں جتنا بھی ٹھہراؤ محسوس کر لیتی، اسے پھر بھی یاد رمیص کی ہی آتی تھی۔یہ وقت ہی ایسا تھا۔نگاہوں کے سامنے بار بار ارحم کی پیدائش کا وقت گھوم رہا تھا۔اس وقت وہ اس کے ساتھ تھا!

ایک ایک پل اس نے اس کا خیال رکھا تھا!

وہ ایک ایک لمحہ اس کے لیے اہم تھا!

وہ شخص بھی تو اہم ترین تھا ناں!

(ماضی کے دھندلے اوراق میں وہ بار بار اس کے بال سہلا رہا تھا۔اس کی نم آنکھیں پونچ رہا تھا۔

اس کو شانے سے تھامے خود سے لگا رہا تھا۔وہ تھا تو لگتا تھا کہ اور کچھ نہیں چاہیئے۔وہ نہیں تھا تو لگتا تھا کہ صرف وہی چاہیئے۔وقت بھی کیسے پلٹا کھاتا ہے ناں!)

اب ارشد صاحب اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔شاید اسے بتا رہے تھے کہ کس بری طرح ارحم صبح اٹھتے ہی رویا تھا۔۔۔مگر اس کا ذہن۔۔۔اس کا ذہن تو کہیں بہت پیچھے بھٹک رکھا تھا۔ماضی کے کسی جال میں۔۔۔حال سے بیگانی ہوئی وہ اس وقت صرف ماضی میں ہی رہنا چاہتی تھی۔

("تم رو کیوں رہی ہو بار بار؟"،وہ اس کے آنسو پونچتا ہوا اس سے نرمی سے پوچھ رہا تھا۔وہ اس وقت اس کے عین سامنے اس کے پلنگ پر بیٹھا تھا۔وہ اس وقت بھی سفید رنگ کے ہسپتال گاؤن میں ملبوس،آنسو بہا رہی تھی۔۔۔مگر تب آنسو پونچنے والا ہاتھ موجود تھا۔۔۔اور آج۔۔۔آج وہ ہاتھ کہیں نہیں تھا۔۔۔کہیں بھی نہیں!)

"ارے غزل باجی۔۔۔آپکو معلوم ہے کہ آج ایمان کی برتھ ڈے ہے؟"،یکدم ہی ارشد صاحب کے برابر میں بیٹھی ثمرین کچھ یاد آنے پر بولی تو سب کی نظریں ایک ساتھ ہی ایمان کی

جانب اٹھی تھیں۔وہ ہلکے سے مسکرادی تھی۔

"واؤ۔۔۔پھر تو ہماری ارحہ اور ایمان کی برتھ ڈے ایک ہی دن ہو گئی۔۔۔ماشاءاللہ۔"،ارشد صاحب مسکرا کر بولے تو غزل بھی مسکرادی۔

"کیک کاٹنا تو بنتا ہے پھر۔"،غزل نے نرمی سے کہا تو ابھی ایمان منع کرنے ہی والی تھی کہ غزل نے اسے ایسی نظر سے دیکھا تھا کہ اس نے بے اختیار ہی زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔

"اوکے۔۔۔اوکے۔۔۔میں نے کچھ کہا کیا؟"،وہ جھینپ کر بولی تو سب یکدم ہی ہنس پڑے۔

باہر دن چڑھ آیا تھا۔انسان و چرند پرند،سب رزق کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے تھے۔ آسمان پر سرمئی بادلوں کا اب بھی بسیرا تھا۔البتہ محض ہلکی بوندا باندی ہی جاری تھی۔ساتھ ٹھنڈی ہواؤں کا زور بھی تھا۔

جاری ہے

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP: